www.cpsglobal.org

الرسالہ

Al-Risala

August 2015 • No. 465 • Rs. 20

امن کا مقصد انصاف حاصل کرنا نہیں ہے۔
امن کا مقصد مواقع کار حاصل کرنا ہے تاکہ
انصاف کے حصول کی جدوجہد کی جا سکے۔

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

الرسالہ

اگست 2015

فہرست

معرفت کا رزق	4
جنت کی دنیا	5
کائناتی عبادت	6
تدبر کی اہمیت	7
موت کے بعد	8
پیغمبر کی حیثیت	9
نتیجہ ایک اشارۂ ربانی	10
فتنۂ دہیماء: فکری کنفیوژن	11
شرحِ صدر کیا ہے	25
تربیت کا ٹکنکل طریقہ	26
صبر واعراض کا اصول	27
توحید اور عدل	29
زمین میں خلافت	30
ٹیم کی تربیت	31
دعوت کی ذمے داری	32
فطرت کا ایک قانون	33
مدعو فرینڈلی روش	34
فکر کی تشکیل	35
اسلام اور دورِ جدید	36
متبادل کو جانیے	43
زندہ قومیں کس طرح کام کرتی ہیں	45
خبر نامہ اسلامی مرکز — 236	47

جاری کردہ 1976

اردو اور انگریزی میں شائع ہونے والا

اسلامی مرکز کا ترجمان

زیر سرپرستی

مولانا وحید الدین خاں

صدر اسلامی مرکز

Al-Risala Monthly

1, Nizamuddin West Market

New Delhi-110 013

Tel. 011-41827083, 46521511

Fax: 011-45651771

email: info@goodwordbooks.com

www.goodwordbooks.com

Subscription Rates

Single copy ₹20

One year ₹200

Two years ₹400

Three years ₹600

Abroad by Air Mail. One year $20

Printed and published by

Saniyasnain Khan on behalf of

Al-Markazul Islami, New Delhi.

Printed at Nice Printing Press,

7/10, Parwana Road,

Khureji Khas, Delhi-110 051

(Total Pages: 52)

معرفت کا رزق

پیغمبرِ اسلام صلی اللہ علیہ وسلم نے رمضان کے مہینے کے بارے میں فرمایا: شهر يزداد فيه رزق المومن (صحیح ابن خزیمہ، حدیث نمبر 1887) یعنی رمضان کا مہینہ وہ مہینہ ہے جس میں مومن کا رزق بڑھا دیا جاتا ہے۔ یہاں رزق سے مراد مادی رزق نہیں ہے، بلکہ معرفت کا رزق ہے۔ یہ وہی رزق ہے جس کو قرآن میں رزقِ رب (20:131) کہا گیا ہے۔

اصل یہ ہے کہ روزے کی حالت میں فطری طور پر روزہ دار کی حساسیت بڑھ جاتی ہے۔ وہ زیادہ سے زیادہ اپنے رب کے بارے میں سوچتا ہے۔ وہ زیادہ سے زیادہ قرآن کا مطالعہ کرتا ہے۔ روزہ کے دوران وہ زیادہ یکسوئی کے ساتھ زندگی کی حقیقت پر غور کرتا ہے۔ اس کے نتیجے میں اس کے اندر روحانیت جاگ اٹھتی ہے، اس کی ذہنی بیداری میں اضافہ ہوتا ہے، وہ زیادہ سنجیدگی کے ساتھ اللہ کی باتوں پر غور وفکر کرنے لگتا ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ دین کی حقیقتوں کو زیادہ گہرائی کے ساتھ دریافت کرتا ہے، وہ اس قابل ہوجاتا ہے کہ وہ زیادہ حکمت کے ساتھ اپنے اور دین کے تعلق کو سمجھ سکے۔ وہ قرآن کی آیتوں کے گہرے معانی کو دریافت کرے۔

رزق کا اضافہ کوئی پراسرار چیز نہیں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ جب آدمی سچی اسپرٹ کے ساتھ روزہ رکھے تو اس کا ذہن عام دنوں کے مقابلے میں زیادہ بیدار ہوجاتا ہے، اس کی سوچ میں زیادہ گہرائی آجاتی ہے، وہ اللہ کی باتوں میں زیادہ سنجیدگی کے ساتھ غور کرنے لگتا ہے۔ روزہ دار کے اندر یہ بڑھی ہوئی کیفیت اس کو اس قابل بنا دیتی ہے کہ وہ دین کے زیادہ گہرے پہلوؤں کا ادراک کر سکے۔ وہ زیادہ گہرے انداز میں معرفت کا رزق حاصل کر سکے۔

روزہ دار کے لیے رزقِ معرفت میں اضافہ صرف بھوک پیاس کی بنا پر اپنے آپ نہیں ہوتا، بلکہ وہ اس وقت ہوتا ہے جب کہ آدمی سچی اسپرٹ کے ساتھ روزہ رکھے۔ اس کا روزہ، قرآن کے الفاظ میں، تقوی اور شکر کا روزہ بن گیا ہو۔

جنت کی دنیا

قرآن میں جنت کے بارے میں مختلف آیتیں آئی ہیں۔ ان میں سے ایک آیت یہ ہے: فَلَا تَعْلَمُ نَفْسٌ مَا أُخْفِيَ لَهُمْ مِنْ قُرَّةِ أَعْيُنٍ جَزَاءً بِمَا كَانُوا يَعْمَلُونَ (32:17)۔ تو کسی کو خبر نہیں کہ ان لوگوں کے لیے ان کے اعمال کے صلہ میں آنکھوں کی کیا ٹھنڈک چھپا رکھی گئی ہے۔

قرآن کی اس آیت میں جنت کے بارے میں ما اخفی لھم کے الفاظ آئے ہیں، یعنی کیا چھپا رکھا گیا ہے (which is kept hidden)۔ اخفی ماضی کا صیغہ ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ جنت آئندہ بننے والی چیز نہیں ہے، بلکہ وہ قرآن کے نزول کے وقت بنی ہوئی موجود تھی۔ اسی لیے قرآن میں دوسری جگہ أُعِدَّتْ لِلْمُتَّقِينَ (3:133) کا لفظ آیا ہے۔ یعنی وہ تیار کی گئی ہے اللہ سے ڈرنے والوں کے لئے۔

قرآن کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ خالق نے انسان کے لیے دو دنیائیں بنائی ہیں۔ ایک موجودہ دنیا (planet earth)، اور دوسری وہ دنیا جس کے لیے قرآن اور حدیث میں جنت کا لفظ استعمال کیا گیا ہے۔ موجودہ دنیا کو ابتلا (آزمائش) کی مصلحت کے تحت بنایا گیا ہے، اور جنت کو ابدی انعام کی مصلحت کے تحت بنایا گیا ہے۔

قرآن کے مطالعے سے مزید معلوم ہوتا ہے کہ دونوں دنیائیں ایک دوسرے کے مشابہ (2:25) ہیں۔ فرق صرف یہ ہے کہ موجودہ دنیا عارضی ہے اور جنت کی دنیا ابدی۔ موجودہ دنیا میں انسان کو آزادی دی گئی ہے، تاکہ ہر فرد کو جانچ کر دیکھا جائے کہ کیا اس کے اندر وہ کردار ہے جو جنت کی معیاری دنیا میں بسائے جانے کے لیے مطلوب ہے۔ جنت چونکہ انعام کی دنیا ہے اس لیے وہاں ہر چیز پرفکٹ اور آئڈیل درجے میں موجود ہے۔ جنت ہر قسم کی محدودیت (limitation) اور نقص (disadvantage) سے پاک ہے۔ موجودہ دنیا وقتی ضرورت کے اعتبار سے بنائی گئی ہے، اور جنت انسان کے کامل فُل فل مینٹ (fulfillment) کے اعتبار سے۔

کائناتی عبادت

قرآن کی سورہ نمبر 45 کی ایک آیت یہ ہے: وَسَخَّرَ لَكُمْ مَا فِي السَّمَاوَاتِ وَمَا فِي الْأَرْضِ جَمِيعًا مِنْهُ إِنَّ فِي ذَٰلِكَ لَآيَاتٍ لِقَوْمٍ يَتَفَكَّرُونَ (الجاثیۃ: 13)۔ یعنی اللہ نے آسمانوں اور زمین کی تمام چیزوں کو تمھارے لیے مسخر کردیا، سب کو اپنی طرف سے۔ بے شک اس میں نشانیاں ہیں ان لوگوں کے لیے جو غور کرتے ہیں۔ قرآن کی اس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ ساری کائنات انسان کے لیے بنائی گئی ہے۔

یہاں یہ سوال ہے کہ اس کائناتی تسخیر کا مقصد کیا ہے۔ جیسا کہ معلوم ہے، کائنات کی وسعت لامحدود حد تک زیادہ ہے۔ اتنی بڑی کائنات انسان کی رہائش گاہ نہیں ہوسکتی۔ یہ بھی ناممکن ہے کہ انسان اتنی بڑی کائنات کو اپنا رزق بنائے۔ پھر اس کہنے کا کیا مطلب ہے کہ ساری کائنات انسان کے لیے بنائی گئی ہے۔

قرآن کی دوسری آیتوں، مثلاً سورہ آل عمران کی آخری رکوع کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ کائنات اس لیے بنائی گئی ہے تاکہ انسان اس پر غور کرے۔ یہ غور کرنا، لُبّ (عقل) کے ذریعے ہوتا ہے، نہ کہ کسی جسمانی عمل کے ذریعے۔ قرآن کی دوسری آیتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ اللہ کی نشانیاں (signs) اتنی زیادہ ہیں کہ ان کی کوئی گنتی نہیں ہوسکتی۔ یہی وہ لامحدود کائناتی نشانیاں ہیں جن پر عقل سے تدبر کرکے انسان اپنے رب کی کائناتی عبادت کرتا ہے۔

یہ صرف انسان ہے جو یہ صلاحیت رکھتا ہے کہ وہ کائناتی نشانیوں میں تدبر (contemplation) کرے۔ یہ تدبر پہلے روایتی فریم ورک میں کیا جاسکتا تھا۔ اب تدبر کا یہ عمل سائنسی فریم ورک میں کرنا ممکن ہوگیا ہے۔ اس طرح انسان اللہ کی بے پایاں عظمت کو دریافت کرتا ہے۔ وہ اللہ سے حبّ شدید اور خوفِ شدید کا تعلق قائم کرتا ہے۔ وہ آخرت کی ابدی جنت کو اپنے تصور میں لاتا ہے۔ یہی تدبر ہے، اور اسی تدبر کو کائناتی عبادت کہا گیا ہے۔

تدبر کی اہمیت

قرآن میں بار بار تدبر پر زور دیا گیا ہے۔ قرآن کی سورہ ص میں یہ آیت آئی ہے: كِتٰبٌ اَنْزَلْنٰهُ اِلَيْكَ مُبٰرَكٌ لِّيَدَّبَّرُوْٓا اٰيٰتِهٖ وَلِيَتَذَكَّرَ اُولُوا الْاَلْبَابِ (38:29) یعنی یہ ایک بابرکت کتاب ہے۔ جو ہم نے تمھاری طرف اتاری ہے، تاکہ لوگ اِس کی آیتوں پر غور کریں اور تاکہ عقل والے اِس سے نصیحت حاصل کریں۔ قرآن کی اِس آیت میں مبارک کا لفظ اِس معنی میں ہے کہ قرآن کی ہر آیت میں گہرے معانی چھپے ہوئے ہیں۔ اِن گہرے معانی کو صرف تدبر (contemplation) کے ذریعہ دریافت کیا جاسکتا ہے۔ اور جب قرآن کی آیتوں پر اِس طرح غور کیا جائے، تو آدمی اُس کے اندر ایسے معانی دریافت کرے گا جو اُس کی عقل کو ایڈریس کرنے والے ہوں۔ اور اُس کی شخصیت میں ربانی انقلاب لانے کا ذریعہ بن جائیں۔

قرآن میں بہت کم ایسی باتیں ہیں، جو صراحت کی زبان میں ہیں۔ زیادہ تر باتیں اُس میں سراغ (clue) کے اسلوب میں ہیں۔ یعنی اِن آیتوں میں گہرے معانی کی طرف اشارہ کیا گیا ہے، جو آدمی کے لیے غور وفکر میں رہنمائی دیتے ہیں۔ یہ اسلوب اِس لیے ہے تاکہ قرآن کے معانی کی دریافت کے ساتھ انسان کے اندر ذہنی ارتقا (intellectual development) کا عمل بھی جاری رہے۔

مثلاً قرآن میں بار بار پانی کا ذکر ہے۔ انسان کے لئے پانی کی اہمیت کو بتایا گیا ہے۔ مگر قرآن میں پانی کے گہرے پہلوؤں کا ذکر نہیں ہے۔ مثلاً پانی انسان کے لئے بہت سے فوائد کا واحد ذریعہ ہے۔ طہارت کے لئے اور دوسرے بہت سے فائدوں کے لیے۔ اِس معاملے میں کوئی بھی چیز پانی کا بدل (substitute) نہیں۔ مگر قرآن میں اِس حقیقت کو لفظی طور پر نہیں بتایا گیا۔ مثلاً یہ نہیں کہا گیا ہے کہ پانی کا کوئی بدل نہیں (لابدیل للماء)۔ پانی کے بارے میں اِس حقیقت کو انسان کے اوپر چھوڑ دیا گیا ہے کہ وہ اِس پر غور کرے، اور پانی کی اِس اہمیت کو دریافت کرکے، خالق کی اعلیٰ معرفت حاصل کرے اور گہرائی کے ساتھ اُس کا شکر ادا کرے۔

موت کے بعد

ایک روایت کے مطابق، پیغمبرِ اسلام صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: إذا مات أحدُكم؛ فقد قامتْ قيامتُه (کنز العمال: 42123) یعنی جب کسی شخص کی موت آتی ہے تو موت کے بعد ہی اس کی قیامت شروع ہوجاتی ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ موت خاتمۂ حیات نہیں، بلکہ موت ایک دورِ حیات سے نکل کر دوسرے دورِ حیات میں داخلہ ہے۔ ایک دور اور دوسرے دور میں کوئی فاصلہ نہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ زندگی ایک تسلسل (continuity) کا نام ہے، موت کا معاملہ صرف منتقلی (transfer) کا ایک معاملہ ہے، یعنی آدمی ایک عالَم سے نکل کر دوسرے عالَم میں پہنچ گیا۔

اصل یہ ہے کہ موجودہ دنیا تعمیرِ شخصیت (personality building) کا مقام ہے۔ یہاں ہر آدمی اپنی شخصیت کی تعمیر کر رہا ہے۔ یہ شخصیت سازی دو طرح کی ہوتی ہے۔ مثبت شخصیت یا منفی شخصیت۔ جو لوگ اس دنیا میں مثبت شخصیت بنائیں گے، وہ موت کے فوراً بعد اپنے آپ کو جنت کے باغوں میں پائیں گے۔ اور جو لوگ اپنے اندر منفی شخصیت بنائیں گے، ان کو موت کے بعد جہنم میں جگہ ملے گی۔ یہی بات حدیث میں ان الفاظ میں آئی ہے: إنما القبرُ روضةٌ من رياضِ الجنةِ أو حفرةٌ من حفرِ النارِ. (سنن الترمذی، حدیث نمبر 2460) یہ حدیث اس وقت سمجھ میں آتی ہے جب کہ ایک اور حدیث کی روشنی میں اس کو سمجھنے کی کوشش کی جائے۔ اس دوسری حدیث کے الفاظ یہ ہیں: إنما هي أعمالكم ترد إليكم (حلیۃ الاولیاء: 5/125) یعنی یہ ہر انسان کے اعمال ہیں جو آخرت میں اس کی طرف لوٹا دیے جائیں گے۔

انسان اور اس کے عمل کے درمیان کوئی دوری نہیں ہوتی۔ جہاں انسان ہے وہیں اس کے اعمال بھی موجود ہوتے ہیں۔ موجودہ دنیا میں انسان کے اعمال بظاہر دکھائی نہیں دیتے۔ لیکن موت کے بعد فوراً وہ ظاہر ہوجائیں گے۔ انسان اپنے آپ کو اچانک اپنے اعمال کے درمیان پائے گا۔ اچھا عمل کرنے والا، اپنے آپ کو اچھے اعمال کے درمیان پائے گا، اور برا عمل کرنے والا اپنے آپ کو برے اعمال کے درمیان پائے گا۔

پیغمبر کی حیثیت

حدیث کی مختلف کتابوں میں ایک روایت آئی ہے۔ صحیح البخاری کے الفاظ یہ ہیں: لا تطروني، كما أطرت النصارى ابن مريم، فإنما أنا عبده، فقولوا عبد الله، ورسوله (صحیح البخاری، حدیث نمبر 3445)۔ یعنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ میری تعریف میں مبالغہ نہ کرو، جیسا کہ نصاری نے ابن مریم کی تعریف میں مبالغہ کیا۔ میں تو صرف اللہ کا ایک بندہ ہوں، تم صرف یہ کہو کہ اللہ کا بندہ اور اس کا رسول۔ اس طرح کی اور بھی روایتیں حدیث کی کتابوں آئی ہیں۔ ان روایتوں کا مطالعہ کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ پیغمبرِ اسلام صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی امت کو سختی کے ساتھ منع کیا تھا کہ وہ اپنے پیغمبر کے ساتھ وہ معاملہ نہ کریں جو پچھلی امتوں نے اپنے پیغمبروں کے ساتھ کیا۔ یعنی پیغمبر کو صرف پیغمبر کے درجے میں رکھیں۔ اس کے ساتھ مبالغہ آمیز مدح خوانی کا طریقہ اختیار نہ کریں۔

یہ کوئی سادہ بات نہیں۔ اس نصیحت میں ایک اہم حکمت چھپی ہوئی ہے۔ امت جب پیغمبر کو عبد اور رسول کا درجہ دے تو امت کے اندر یہ مزاج بنے گا کہ وہ اپنی زندگی میں پیغمبر کی پیروی کرے، وہ اپنے آپ کو پیغمبر کے نمونے پر ڈھالے، وہ ہر معاملے میں اپنے آپ کو ویسا ہی بنائے جیسا کہ پیغمبر نے اپنے آپ کو ہر معاملے میں بنایا۔ اطراء کا مطلب ہے مبالغہ آمیز مدح خوانی (to praise highly)۔ امت جب اپنے پیغمبر کے بارے میں اطراء کی روش میں مبتلا ہو جائے تو امت کے افراد کے اندر یہ ذہن بنتا ہے کہ پیغمبر کے بارے میں ہمارا کام یہ ہے کہ اس کی مبالغہ آمیز نعت خوانی کریں۔ اس کے نام کے ساتھ بڑے بڑے القاب شامل کریں۔ پیغمبر کی اسی طرح قصیدہ خوانی کریں، جس طرح پہلے زمانے میں بادشاہوں کی قصیدہ خوانی کی جاتی تھی۔ اس اطراء کا ایک ظاہرہ یہ ہے کہ امت کے افراد اپنے پیغمبر کے بارے میں بہت زیادہ حساس ہو جاتے ہیں۔ ان کے خیال کے مطابق اگر کوئی شخص پیغمبر کی ذات کے معاملے میں گستاخی کا کلمہ کہہ دے تو وہ بھڑک اٹھیں گے، اور چاہیں گے کہ ایسے آدمی کو قتل کر ڈالیں۔ ایسے لوگ اپنے پیغمبر کے بارے میں جو کتابیں لکھیں گے ان میں شاعرانہ مبالغہ آرائی تو بہت ہوگی لیکن علمی اور تاریخی مواد ان کے اندر بہت کم پایا جائے گا۔

نتیجہ ایک اشارۂ ربانی

عن أبي هريرة، قال: قال رسول الله صلى الله عليه وسلم: من حسن إسلام المرء تركه مالا يعنيه (ابن ماجہ، حدیث نمبر: 3976)۔یعنی آدمی کے اسلام کی خوبی یہ ہے کہ وہ اس کام کو چھوڑ دے جس میں کوئی فائدہ نہیں۔

یہ حدیث رسول ہم کو ایک معیار (criterion) دیتی ہے۔جس کی کی روشنی میں ہم اپنے عمل کو جانچتے رہیں۔جو عمل عملاً نتیجہ خیز ثابت ہو، اس پر قائم رہیں، اور جو عمل بے نتیجہ ثابت ہو اس کو چھوڑ دیں۔

اس حدیث کا تعلق عبادت جیسے معاملات سے نہیں ہے۔بلکہ ان امور سے ہے جو دنیا میں کسی نتیجے کے لیے کیے جاتے ہیں۔مثلاً دشمن سے قتال کا معاملہ اگر ہمارا کوئی دشمن پایا جائے اور ایسے حالات پیدا ہوں کہ اس کے ساتھ قتال کرنا چاہیے۔تب بھی قتال برائے قتال کا طریقہ اختیار نہیں کیا جائے گا، بلکہ قتال برائے نتیجہ کا طریقہ اختیار کیا جائے گا۔

مثال کے طور پر موجودہ زمانے کے مسلمان سو سال سے زیادہ مدت سے جہاد کے نام پر قتال کر رہے ہیں، وہ اپنے مفروضہ دشمنوں کے خلاف متشددانہ جنگ چھیڑے ہوئے ہیں، لیکن جانی اور مالی قربانیوں کے باوجود اس عمل کا مطلوب نتیجہ مسلمانوں کو نہیں ملا۔اب مذکورہ حدیث کے مطابق، مسلمانوں کو یہ کرنا ہے کہ وہ توبۂ جمیع (24:31) پر عمل کریں، اور یک لخت اپنی تمام متشددانہ سرگرمیوں کو ختم کر دیں۔جب وہ ایسا کریں گے تو ان کو نظر آئے گا کہ ان کے کرنے کا اصل کام پر امن دعوت ہے نہ کہ متشددانہ سرگرمیاں۔

یہی اس وقت اسلامی تعلیمات کا تقاضا ہے۔تشدد خواہ جہاد کے نام سے کیا جائے، لیکن وہ تشدد ہے۔اور عملی اعتبار سے اس کا مثبت نتیجہ نہیں نکلنا اس بات کی علامت ہے کہ اللہ کے نزدیک وہ کوئی مطلوب اسلامی عمل نہیں۔اگر وہ مطلوب اسلامی عمل ہوتا تو اس پر ضرور اللہ کی نصرت نازل ہوتی۔جیسا کہ قرآن میں آیا ہے: وَكَانَ حَقًّا عَلَيْنَا نَصْرُ الْمُؤْمِنِينَ (30:47)۔یعنی اور ہم پر یہ حق تھا کہ ہم مومنوں کی مدد کریں۔

فتنۂ دہیماء: فکری کنفیوژن

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کی ایک حدیث دورِ فتنہ کے بارے میں آئی ہے۔ یہ ایک لمبی حدیث ہے، اس کا ایک حصہ یہ ہے: ثم فتنة الدُّهيماء لا تدع أحداً من هذه الأمة إلا لطمته لطمة (سنن أبي داؤد، حدیث نمبر: 4244) یعنی آخری زمانے میں فتنہ دہیماء ظاہر ہوگا۔ وہ اتنا زیادہ عام ہوگا کہ امت کا کوئی بھی شخص نہیں بچے گا جو اِس فتنے کی زد میں نہ آجائے:

It will hit everyone without any exception.

اِس حدیثِ رسول میں دُہیماء کا لفظ استعمال ہوا ہے۔ دہیما کے لیے مشہور عربی لغت لسان العرب میں یہ الفاظ آئے ہیں: الفتنة السوداء المظلمة (12/211)۔ دہیماء کی تصغیر مبالغہ کے لیے ہے، یعنی فتنۂ دہیماء، بہت زیادہ سیاہ اور سخت تاریکی پیدا کرنے والا فتنہ ہوگا۔ اِس حدیثِ رسول کے مطابق، فتنۂ دہیماء کا زمانہ مکمل تاریکی کا زمانہ (age of total darkness) ہوگا۔ تاریکی سے مراد فکری تاریکی (intellectual darkness) ہے۔ دوسرے الفاظ میں، اِس کا مطلب ہے — مکمل فکری کنفیوزن (utter intellectual confusion)۔

قانونِ فطرت کے مطابق، یہ دور اچانک نہیں آئے گا، بلکہ تدریجی عمل (gradual process) کے تحت آئے گا۔ یہ واقعہ خود امتِ مسلمہ کے اندر پیش آئے گا اور یہ اُس حالت کا ایک ظاہرہ ہوگا جس کو زوالِ امت کہا جاتا ہے۔ مذکورہ روایت کے الفاظ کے مطابق، فتنۂ دہیماء کی یہ صورتِ حال اصلاً خود امت کے اندر پیش آئے گی، نہ کہ امت کے باہر۔

ایک روایت کے مطابق، پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے اصحاب کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا کہ میں تم کو ایک ایسے دینِ بیضا پر چھوڑ رہا ہوں جس کی راتیں بھی دن کی طرح روشن ہیں: قد تركتم على البيضاء، ليلها كنهارها (مسند احمد، حدیث نمبر: 17142)۔ مگر بعد کے زمانے میں امت کے اندر بہت زیادہ اختلاف (اختلافا كثيراً) پیدا ہوجائے گا۔ اِس اختلافِ کثیر سے مراد وہی چیز

ہے جس کو مذکورہ حدیث میں فتنۂ دہیماء کہا گیا ہے، یعنی قرآن وحدیث کی تشریح وتعبیر میں اختلافات سے تصورِ دین کا غیر واضح ہوجانا۔

اختلاف کا سبب

امت کی بعد کی نسلوں میں فکری اختلاف کا سبب کیا ہے۔ یہ سبب وہی ہے جو پچھلی امتوں میں پیدا ہوا۔ پچھلی امتوں کا واقعہ امتِ مسلمہ کے معاملے کو سمجھنے کے لیے ایک تاریخی مثال کی حیثیت رکھتا ہے۔ یہ حقیقت قرآن کی سورہ البینۃ میں ان الفاظ میں بیان کی گئی ہے: وَمَا تَفَرَّقَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ اِلَّا مِنْۢ بَعْدِ مَا جَآءَتْهُمُ الْبَيِّنَةُ ○ وَمَآ اُمِرُوْٓا اِلَّا لِيَعْبُدُوا اللّٰهَ مُخْلِصِيْنَ لَهُ الدِّيْنَ ۙ حُنَفَآءَ وَيُقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَيُؤْتُوا الزَّكٰوةَ وَذٰلِكَ دِيْنُ الْقَيِّمَةِ ○ (98:4-5) یعنی جو لوگ اہلِ کتاب تھے، وہ واضح دلیل آجانے کے بعد مختلف ہوگئے۔ حالاں کہ ان کو یہی حکم دیا گیا تھا کہ وہ اللہ کی عبادت کریں۔ اس کے لیے دین کو خالص کردیں، یکسو ہوکر اور نماز قائم کریں اور زکوٰۃ دیں، اور یہی درست دین ہے۔

پچھلی امتوں میں جو واقعہ پیش آیا، وہ یہ تھا کہ اُن کو اللہ کی کتاب دی گئی تھی، لیکن ان کی بعد کی نسلوں کے درمیان کتاب کی تشریح وتوضیح میں علماء کے درمیان اختلافات پیدا ہوئے۔ ان اختلافات کی بنا پر امت مختلف گروہوں میں بٹ گئی۔ اختلاف کا یہی واقعہ، فطرت کے قانون کے مطابق، امتِ مسلمہ کی بعد کی نسلوں میں پیش آئے گا۔ دونوں کا مشترک سبب ایک ہے۔

یہ معاملہ کیوں پیش آتا ہے۔ اِس کا سبب یہ ہے کہ امت کی ابتدائی نسل میں دین اپنی اسپرٹ کے اعتبار سے زندہ ہوتا ہے۔ لوگوں پر یہ بات واضح ہوتی ہے کہ دین اصلاً اسپرٹ کا نام ہے۔ جہاں تک اس کی ظاہری صورت یا فارم (form) کا تعلق ہے، وہ دین کا ایک اضافی حصہ (relative part) ہے۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ اسپرٹ میں ہمیشہ یکسانیت ہوتی ہے۔ اِس لیے امت جب تک اسپرٹ والے دین پر قائم ہو، اُس وقت تک اس کا اتحاد باقی رہتا ہے، لیکن بعد کے دور میں زوال کی بنا پر اسپرٹ مفقود ہوجاتی ہے اور لوگ دین کے فارم کو اصل دین سمجھ لیتے ہیں۔ چوں کہ فارم میں ہمیشہ

اختلاف ہوتا ہے، اِس لیے امت جب زوال کا شکار ہوکر فارم پر قائم ہوجائے تو ہمیشہ اختلافات پیدا ہوتے ہیں۔ پہلے اختلاف آتا ہے، پھر فرقہ بندی ہوتی ہے اور پھر مختلف گروہوں کے درمیان تشدد شروع ہوجاتا ہے۔

اِس معاملے کی ایک مثال یہ ہے کہ ایک حدیثِ رسول میں آیا ہے: لا صلاۃ إلا بفاتحۃ الکتاب (مسند احمد، حدیث نمبر: 22671) یعنی سورہ الفاتحہ کے بغیر کوئی نماز، نماز نہیں۔ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد صحابہ کے زمانے میں بھی لوگوں کو معلوم تھا، لیکن اِس کی بنا پر لوگوں کے درمیان کوئی اختلاف پیدا نہیں ہوا، کیوں کہ اس زمانے میں اسپرٹ بھرپور طور پر زندہ تھی۔ لوگ سمجھتے تھے کہ اصل چیز یہ ہے کہ حالتِ نماز میں سورہ الفاتحہ کے معانی کی یاددہانی ہوتی رہے۔ سرّی نمازوں میں ہر آدمی خود سورہ الفاتحہ پڑھتا تھا اور جہری نمازوں میں ہر آدمی یہ سمجھتا تھا کہ امام کی زبان سے سورہ الفاتحہ کو سن کر قرأتِ فاتحہ کا مقصد نیابتاً حاصل ہوگیا۔

لیکن بعد کے زمانے میں جب امت کے اندر زوال آیا اور ساری اہمیت عبادت کے فارم کو دی جانے لگی، اُس وقت اِس حدیث کو لے کر لوگوں کے درمیان زبردست اختلاف پیدا ہوگیا۔ ایک گروہ نے کہا کہ جہری نمازوں میں سورہ الفاتحہ کی نیابۃً ادائیگی کافی ہے۔ دوسرے گروہ نے کہا کہ نہیں، ہر مصلی کو لازماً اپنی نماز میں ذاتی طور پر سورہ الفاتحہ پڑھنا چاہیے، حتی کہ جہری نمازوں میں جب کہ امام بلند آواز سے قرأت کر رہا ہو، تب بھی مقتدیوں پر لازم ہے کہ وہ آہستہ آہستہ سورہ الفاتحہ پڑھیں، ورنہ ان کی نماز نہیں ہوگی۔

قرآن کی مذکورہ آیت (98:4-5) میں اِسی حقیقت کو بیان کیا گیا ہے۔ زوال کے دور میں پچھلی امتوں کے درمیان اِسی سبب سے اختلافات پیدا ہوئے۔ امتِ مسلمہ کے درمیان بھی اس کے زوال کے دور میں یہی صورت حال لازماً پیش آئے گی اور اِس اختلاف کی بنا پر دین میں رایوں کا اختلاف اتنا زیادہ بڑھ جائے گا کہ عام انسان کے لیے یہ سمجھنا مشکل ہوجائے گا کہ خدا کا بھیجا ہوا اصل دین (دینِ قیم) کیا ہے۔

پیغمبرانہ پیشین گوئی

حضرت علی سے روایت ہے، وہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: یوشك أن یأتي علی الناس زمان لا یبقی من الإسلام إلا اسمه، ولا یبقی من القرآن إلا رسمه- مساجدهم عامرة وهي خراب من الهدی۔ علماءهم شر من تحت أدیم السماء، من عندهم تخرج الفتنة وفیهم تعود (شعب الایمان للبیہقی، حدیث نمبر: 1763) یعنی قریب ہے کہ لوگوں کے اوپر وہ زمانہ آئے جب کہ اسلام کا صرف نام باقی رہے اور قرآن کی صرف تحریر باقی رہے۔ ان کی مسجدیں بظاہر آباد ہوں گی، لیکن وہ ہدایت سے خالی ہوں گی۔ اُن کے علماء آسمان کے نیچے سب سے برے لوگ ہوں گے۔ ان سے فتنہ نکلے گا، اور انھیں کی طرف فتنہ لوٹے گا۔

اِس حدیث رسول کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ اِس میں اُس وقت کی پیشین گوئی ہے جب کہ دہیماء کا فتنہ اپنی آخری حد تک پہنچ چکا ہوگا۔ اُس زمانے میں بظاہر اسلام کے نام پر بڑی بڑی سرگرمیاں دکھائی دیں گی، لیکن اِس سرگرمیوں میں دین کی اصل حقیقت موجود نہ ہوگی۔ قرآن کے نسخے ہر جگہ موجود ہوں گے، لیکن لوگ قرآن کے صرف الفاظ کو جانتے ہوں گے، قرآن کے معانی سے وہ بالکل بے خبر ہوں گے۔

امت کا فکری زوال

ایک حدیث رسول میں بتایا گیا ہے کہ: خیر أمتي قرني، ثم الذین یلونهم، ثم الذین یلونهم (صحیح البخاری، حدیث نمبر: 3650)۔ اِس حدیث رسول میں اسلام کے تین ادوار کو خیر کے ادوار کہا گیا ہے۔ اِن ادوار کو قرونِ ثلاثہ یا قرونِ مشہود لہا بالخیر کہا جاتا ہے۔ اِن تین ادوار سے مراد ہے — عہدِ رسالت، عہدِ صحابہ، عہدِ تابعین۔ اِن تین ابتدائی ادوار کی مدت پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات (632ء) کے بعد تقریباً ایک سو سال تک جاری رہی۔ اِس کے بعد وہ دور شروع ہو گیا جو قرونِ مشہود لہا بالخیر کے بعد کا دور تھا۔ گویا کہ اسلام کی تاریخ میں مستند ادوار صرف ابتدائی تین ادوار ہیں۔ بعد کے ادوار کو اسلام میں مستند حیثیت حاصل نہیں۔

اِس مسئلے کی مزید تعیین کی جائے تو کہا جائے گا کہ اسلام کے ابتدائی تین ادوار میں اسلام کا فکری مرجع تمام تر قرآن تھا۔ ثانوی مرجع کے طور پر حدیث بھی اِس میں شامل ہے، کیوں کہ حدیث قرآن کی تشریح ہے۔ حدیث کے بغیر قرآن کو درست طور پر سمجھنا ممکن نہیں۔ تقریباً سو سال بعد اسلام کی تاریخ میں ایک نیا دور شروع ہوا جس کو فقہی دور کہا جاسکتا ہے۔ یہ وہ دور ہے جب کہ ساسانی ایمپائر اور بازنطینی ایمپائر کے علاقے فتح ہوئے اور بتدریج اِس علاقے کے لوگ اسلام میں داخل ہونا شروع ہوئے۔ اس کے بعد اسلام کی تاریخ میں ایک نیا ظاہرہ پیدا ہوا جس کو عمومی قبولِ اسلام (mass conversion) کہا جاتا ہے۔ یہ لوگ اسلام سے پہلے مجوسی مذہب یا مسیحی مذہب میں شامل تھے۔ اِن تمام مذاہب میں اُس وقت ساری اہمیت صرف فارم (form) کو دی جاتی تھی۔ اِن لوگوں نے جب اسلام قبول کیا تو اپنے قدیم مائنڈ سیٹ (mindset) کے تحت وہ یہ جاننے کی کوشش کرنے لگے کہ اسلام کا فارم کیا ہے۔ یہی وہ دور ہے جب کہ اسلام کی تاریخ میں وہ شعبہ پیدا ہوا جس کو فقہ کہا جاتا ہے۔

یہی وہ زمانہ ہے جب کہ حدیثوں کی جمع وتدوین شروع ہوئی۔ فقہاء نے فارم کے بارے میں لوگوں کے سوالات کا جواب معلوم کرنے کے لیے حدیثوں کو دیکھا۔ احادیث کے ذخیرے میں مختلف صحابہ کی زبان سے یہ بتایا گیا تھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کس طرح عبادت کرتے تھے۔ فقہا کو معلوم ہوا کہ اِس معاملہ میں صحابہ کی روایتیں مختلف ہیں۔ مثلاً کسی صحابی کی روایت آمین بالسر کے حق میں تھی تو کسی صحابی کی روایت آمین بالجہر کے حق میں تھی۔ احادیث کے ذخیرے میں اِس طرح کے کثیر اختلافات موجود تھے۔

یہیں سے مسلمانوں میں ایک ڈی ریلمنٹ (derailment) شروع ہوا۔ فقہاء کو یہ کہنا چاہئے تھا کہ دین میں اگرچہ اسپرٹ ایک ہے، لیکن فارم میں تنوع (diversity) پایا جاتا ہے، اِس لیے تم جس صحابی کی روایت پر چاہو عمل کرو۔ البتہ تم کو سب سے زیادہ دھیان اسپرٹ پر دینا چاہیے۔ لیکن فقہاء نے یہاں بطور خود یہ اصول وضع کیا کہ فارم کے بارے میں مختلف روایتوں میں

کوئی ایک ہی روایت درست ہوسکتی ہے، اِس لیے اِس ذہن کے تحت انھوں نے ترجیح کا اصول وضع کیا۔ وہ بحث ومباحثہ کے ذریعے ایک طریقے کو راجح اور دوسرے طریقہ کو مرجوح قرار دینے لگے۔ ترجیح کا یہ اصول سب کو ایک رائے پر جمع نہیں کرسکتا تھا، کیوں کی امام شافعی کے الفاظ میں، ساری بحثوں کے باوجود فریقِ ثانی کے حق میں یہ احتمال باقی رہتا تھا کہ شاید اس کی رائے درست ہو۔

دین میں اسپرٹ کے بجائے فارم کو اہمیت دینے کا یہ فقہی طریقہ بعد کے لوگوں کے لیے ایک رجحان ساز (trendsetter) واقعہ بن گیا۔ اِس کے بعد دینی موضوعات پر جو کتابیں لکھی گئیں، وہ تقریباً سب کی سب اِسی نہج پر لکھی گئیں۔ یہ سلسلہ آج تک جاری ہے — دین بیضا کا دینِ غیر بیضا بن جانے کا اصل سبب یہی ہے۔

اگر آپ فقہی کتابوں کا مطالعہ کریں تو آپ پائیں گے کہ فقہ میں بظاہر اسلام کی مختلف تعلیمات زیر بحث آتی ہیں، لیکن عملاً تمام فقہی بحثیں اِن تعلیمات کے فارم پر ہوتی ہیں۔ فقہ کا یہ پیٹرن اصولی بنیاد پر نہیں بنا، بلکہ حالات کے زیر اثر (situational factor) بنا ہے۔ آپ قرآن کو پڑھیں تو معلوم ہوگا کہ قرآن میں سارا زور اسلام کی اسپرٹ پر دیا گیا ہے، لیکن فقہ میں ایک شفٹ آف ایمفیسس (shift of emphasis) کا واقعہ پیش آیا اور سارا زور اسپرٹ کے بجائے فارم پر دیا جانے لگا۔

قرآنی پیٹرن کے بجائے فقہی پیٹرن

اِس کے بعد مزید یہ ہوا کہ فقہ کا یہ اسلوب، عملاً اہلِ علم کے درمیان عام ہوگیا۔ بعد کے اہلِ علم نے اِسی پیٹرن کو معیاری پیٹرن کی حیثیت سے اختیار کرلیا۔ وہ اِسی انداز میں سوچنے لگے اور اِسی انداز پر کتابیں لکھنے لگے۔ یہ فقہی پیٹرن اتنا زیادہ عام ہوا کہ بعد کے زمانے میں لکھی جانے والی کتابوں میں شاید کوئی بھی کتاب اِس سے مستثنیٰ نہیں۔

مثلاً ابن تیمیہ (وفات: 1328ء) کی کتاب 'الصارم المسلول علی شاتم الرسول' اِسی نہج کی ایک کتاب ہے۔ اِس کتاب میں ابن تیمیہ نے شاتمِ رسول کے لیے قتل کی سزا بتائی ہے۔ صرف اِس لیے کہ فقہا نے بعد کے زمانے میں یہ حکم وضع کیا کہ شاتم کو بطور سزا قتل کیا جائے گا (یُقتل حدًّا)۔

حالاں کہ قرآن میں اس حکم کی کوئی اصل موجود نہیں۔ ابن تیمیہ اگر کتبِ فقہ سے اوپر اٹھ کر اِس موضوع پر قرآن کی اسپرٹ کے مطابق، اِس مسئلے پر غور کرتے تو وہ لکھتے کہ شاتم کی حیثیت ایک مدعو کی ہے، شاتم کو دعوت دینا ہے، نہ کہ قتل کرنا۔ شاتم بظاہر دشمن نظر آتا ہو، تب بھی اپنی فطرت کے اعتبار سے، وہ ایک انسان ہے۔ اگر اس کے سامنے اسلام کا دین حکیمانہ انداز میں پیش کیا جائے تو عین ممکن ہے کہ وہ اسلام کی حقانیت کا اعتراف کرے اور اس کی دشمنی دوستی میں تبدیل ہو جائے (41:34)۔

اِس طرح کی ایک مثال شاہ ولی اللہ دہلوی (وفات: 1762ء) کی مشہور کتاب حجۃ اللہ البالغۃ ہے۔ اِس کتاب کا ٹائٹل بظاہر قرآن کی ایک آیت (6:149) سے ماخوذ ہے۔ مگر عملاً یہ کتاب قرآنی پیٹرن پر نہیں لکھی گئی ہے، بلکہ فقہی پیٹرن پر لکھی گئی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اِس کتاب کے تمام مباحث فقہی اسلوب پر مبنی ہیں۔ مثلاً اس کتاب میں سُترہ سے لے جہاد تک کے تمام ابواب موجود ہیں، لیکن اِس میں دعوت الی اللہ کا باب موجود نہیں۔ حالاں کہ اگر مصنف، قرآن کے اسلوب کا تتبع کرتے تو یقیناً وہ اِس حقیقت کو دریافت کر لیتے کہ قرآن میں سب سے زیادہ اہمیت دعوت الی اللہ کو دی گئی ہے۔ قرآن پورا کا پورا ایک کتابِ دعوت ہے۔

معانی کے بجائے الفاظ کی اہمیت

اسلام کو مبنی بر فارم مذہب (form-based religion) قرار دینے کا دوسرا شدید تر نقصان یہ ہوا کہ اسلام میں عقلی توجیہہ (rational interpretation) کا مزاج ختم ہو گیا۔ قرآن وحدیث کے مطالعے میں ساری اہمیت لفظی تشریح (literal interpretation) کو دی جانے لگی۔ بعد کے زمانے میں مسلم اہلِ علم نے جو کتابیں لکھیں، وہ تقریباً سب کی سب اِسی نہج پر لکھی گئیں۔ اِس معاملے میں غالباً صرف ایک کتاب مقدمۃ ابن خلدون کا استثنا ہے۔ اِس منہج فکر کا نتیجہ یہ ہوا کہ مسلمانوں کے اندر عملاً عقلی غور وفکر مکمل طور پر مفقود ہو گیا۔

علامہ انور شاہ کشمیری (وفات: 1934ء) برصغیر ہند کے مشہور عالم ہیں۔ انھوں نے لکھا ہے کہ حدیث (الحلال بیّن والحرام بیّن) کو سمجھنے کے لیے انھوں نے حدیث کی تمام متداول شرحیں

دیکھیں، مگر کسی شرح میں انھیں اس حدیث کی کوئی بامعنی وضاحت نہیں ملی۔ چناں چہ وہ اپنا تاثر اِن الفاظ میں بیان کرتے ہیں: لم یتحصّل عندنا منه شيء غير حلّ الألفاظ (فيض الباري على صحيح البخاري: 153/1) یعنی حلِ الفاظ کے سوا مجھے اِس میں کچھ اور نہیں ملا۔ علامہ انور شاہ کشمیری کا یہ تبصرہ حدیث کی تمام شرحوں پر صادق آتا ہے۔

دو مثالیں

اِس معاملے کو سمجھنے کے لیے یہاں دو مثالیں نقل کی جاتی ہیں۔ اسلام کی تعلیمات میں ایک مسئلہ وہ ہے جس کو خفین پر مسح کا مسئلہ کہا جاتا ہے، یعنی مسافر آدمی اگر وضو کرکے موزوں کے اوپر مسح کرے تو تین دن تک اُس کو وضو کے موقع پر اپنا پاؤں دھونے کی ضرورت نہیں۔ اُس کے لیے صرف موزوں کے اوپر مسح کرنا کافی ہوگا۔ اِس شرعی مسئلے کے بارے میں امام ابوحنیفہ (وفات: 767ء) کہتے ہیں کہ دین کی بنیاد اگر رائے (عقل) پر ہوتی تو میں کہتا کہ پاؤں کے نیچے سے مسح کیا جائے، نہ کہ پاؤں کے اوپر سے۔

امام ابوحنیفہ کا یہ قول صرف اِس لیے ہے کہ انھوں نے اِس معاملے میں حدیثِ رسول کو محض الفاظ کے اعتبار سے لیا۔ انھوں نے اِس حدیث رسول پر عقلی اعتبار سے غور نہیں کیا۔ اگر وہ اِس حکم پر غور کرتے تو وہ کہتے کہ مسح علی الخفین وضو کا بدل نہیں ہے، بلکہ وہ وضو کی ایک علامت ہے۔ آدمی جب موزے کے اوپر مسح کرتا ہے تو وہ علامتی طور پر وضو کے حکم کی تعمیل کرتا ہے، اور جب وہ علامتی ہے تو یہ بات اضافی ہوجاتی ہے کہ پاؤں کی کس سمت سے مسح کیا جائے۔

اِسی طرح اِس معاملے کی ایک مثال ابن قیم الجوزیہ (وفات: 1350ء) کی مشہور کتاب 'طریق الهجرتین وباب السعادتین' ہے۔ اِس کتاب میں مصنف نے ہجرت کی دو تقسیم کی ہے— ایک، اللہ کی طرف ہجرت، یعنی اللہ کی عبادت اور اللہ سے محبت، وغیرہ۔ دوسرے، رسول کی طرف ہجرت، یعنی رسول کی سنت کا اتباع۔

اسلام میں ہجرت یا مہاجرت صرف ایک چیز کا نام ہے اور وہ صرف ترک وطن

(migration) ہے۔ مصنف نے دو ہجرت کا تصور صرف ایک لفظی بنیاد پر اخذ کیا ہے، وہ یہ کہ صحیح البخاری کی پہلی روایت جو نیت کے بارے میں ہے، اس میں یہ الفاظ آئے ہیں: فمن كانت هجرته إلى الله ورسوله (صحيح البخاري، حدیث نمبر: 54) اس حدیث میں طریقِ ہجرت کو بیان نہیں کیا گیا ہے، بلکہ نیتِ ہجرت کو بیان کیا گیا ہے، یعنی اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ ہجرت کی دو قسمیں ہیں، بلکہ اس کا مطلب صرف یہ ہے کہ اپنی حقیقت کے اعتبار سے، ہجرت صرف وہ ہے جو رضاءالٰہی کے جذبہ سے کی جائے۔

اِس اسلوب کا نقصان یہ ہے کہ اس میں وضوح (clarity) کا خاتمہ ہوگیا ہے۔ اِس کتاب کو پڑھ کر آدمی صحیح طور پر نہ ہجرت کی حکمت کو سمجھ پاتا ہے اور نہ دوسرے مذکورہ اعمال کی حکمت کو۔ گویا جدید تعلیم کی اصطلاح میں یہ ایک مائنس مارکنگ (minus marking) کا معاملہ ہے جس میں دونوں قسم کے احکام کی گہری معنویت قاری کے ذہن سے حذف ہوجاتی ہے۔

بعد کے زمانے میں جو کتابیں لکھی گئیں، وہ تقریباً سب کی سب اِسی اسلوب پر لکھی گئیں۔ اسلام کی ابتدائی تین نسلوں تک لوگوں کے درمیان قرآنی طرزِ فکر غالب تھا۔ بعد کو مسلمانوں میں جو دور آیا، اس میں عام طور پر فقہی اسلوب کا غلبہ ہوگیا۔ تاہم پرنٹنگ پریس کے وجود میں آنے سے پہلے اِس ذہن کی اشاعت صرف محدود پیمانے پر ہوسکتی تھی، کیوں کہ اُس زمانے میں کتابیں مخطوطات (manuscripts) کی شکل میں ہوتی تھیں اور مخطوطات کے ذریعے کسی فکر کی عمومی اشاعت ممکن نہیں تھی۔ اٹھارھویں صدی عیسوی میں جب پریس کا زمانہ آیا تو اس کے بعد مسلم اہلِ علم کی کتابیں چھپ کر عمومی طور پر پھیلنے لگیں، یہاں تک کہ بیسویں صدی میں یہ حال ہوا کہ ہر زبان میں اِس قسم کی مطبوعہ کتابیں اتنا زیادہ عام ہوئیں کہ کوئی بھی مسلمان اُس سے بے خبر نہ رہا۔

مذکورہ حدیثِ رسول میں جس فتنۂ دہیماء کا ذکر ہے، وہ اصلاً یہی فتنہ ہے، یعنی قرآنی طرزِ فکر کا خاتمہ اور فقہی طرزِ فکر کی عمومی اشاعت اور پھر دورِ پریس میں اس کا اتنا زیادہ بڑھ جانا کہ کوئی بھی مسلمان اس کی زد سے محفوظ نہ رہے۔

فہمِ دین

دینِ اسلام کی بنیاد قرآن پر ہے۔ قرآن کا صحیح فہم ہی دین کے صحیح فہم کا ضامن ہے۔ قرآن کو سمجھنے میں اگر غلطی ہوجائے تو دین کو صحیح طور پر سمجھنا ممکن نہ ہوگا۔ اصحابِ رسول کو دینِ اسلام میں ماڈل کی حیثیت حاصل ہے اور اصحابِ رسول کی پوری تربیت اسی قرآن کی بنیاد پر ہوئی تھی۔

حضرت جندب بن عبد اللہ البجلی سے روایت ہے، وہ کہتے ہیں: كنا مع النبي صلى الله عليه وسلم، ونحن فتيان حزاورة، فتعلمنا الإيمان قبل أن نتعلم القرآن، ثم تعلمنا القرآن فازددنا به إيمانا (ابن ماجہ، حدیث نمبر: 61) یعنی ہم کچھ نوجوان نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ رہتے تھے۔ ہم نے آپ کے ساتھ رہ کر ایمان سیکھا، اس سے پہلے کہ ہم قرآن سیکھیں۔ اِس کے بعد ہم نے قرآن سیکھا تو قرآن ہمارے لیے اضافۂ ایمان کا ذریعہ بن گیا۔

اِس روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ قرآن فہمی کے سلسلے میں سب سے پہلا کام یہ ہے کہ قرآن کے مرکزی مضمون (central theme) کو دریافت کیا جائے۔ قرآن کے مرکزی مضمون کی دریافت ہی وہ چیز ہے جو پوری قرآن کو بامعنی بناتی ہے۔ جب ایسا ہوتا ہے تو اس کے بعد مومن کے ذہن میں ایک ربانی پراسس جاری ہوجاتا ہے۔ اِس کے بعد ایک تدریجی عمل کے ذریعے اس کے اندر اُس شخصیت کی تعمیر ہوتی ہے جس کو مومن کہا جاتا ہے۔

غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ قرآن کا مرکزی مضمون یہ ہے کہ انسان کو خالق کے تخلیقی منصوبہ (creation plan of God) سے آگاہ کیا جائے، تاکہ انسان اس کے مطابق، اپنی زندگی کی کامیاب تعمیر کرسکے۔ اِس تعمیرِ شخصیت کا آغاز خدا کی معرفت (realization of God) سے ہوتا ہے۔

اِس کے بعد آدمی یہ دریافت کرتا ہے کہ اس کو اپنی ذات کی نسبت سے، اللہ کا عبادت گزار بننا ہے، اور دوسرے انسانوں کی نسبت سے، اس کو پُرامن دعوت الی اللہ کا کام کرنا ہے۔ یہی تین چیزیں ہیں جو ایک انسان کے اندر مومنانہ شخصیت کی تعمیر کرتی ہیں۔

وضوح کا مسئلہ

اسلام کے دورِاول (قرون مشهود لها بالخير) میں دین کا یہی تصور غالب تصور کی حیثیت رکھتا تھا۔اس کے بعد دھیرے دھیرے اِس میں کمی (erosion) شروع ہوئی اور پھر وہ وقت آیا جب کہ عمومی طور پر دین کا یہ تصور گم ہوگیا۔عمر بن عبدالعزیز (وفات: 720ء) غالباً اسلام کے دورِاول کے آخری شخص ہیں۔

اموی خلیفہ عمر بن عبدالعزیز کا زمانہ وہ ہے جب کہ لوگ بڑے پیمانے پر اسلام قبول کررہے تھے۔اس کے نتیجے میں بیت المال میں آنے والے جزیہ کی رقم بہت کم ہوگئی تھی۔چنانچہ خراسان کے ایک گورنر جراح بن عبداللہ نے عمر بن عبدالعزیز سے شکایت کی اور کہا کہ مفتوح ممالک میں لوگ کثرت سے اسلام قبول کررہے ہیں۔چوں کہ اسلام لانے کے بعد جزیہ ساقط ہوجاتا ہے، اس لیے لوگوں کے بکثرت اسلام میں داخل ہونے کی وجہ سے مملکت کا مالیہ بہت کم ہوگیا ہے۔اگر یہی حالت رہی تو خزانہ خالی ہوجائے گا۔عمر بن عبدالعزیز نے گورنر کو لکھا— اللہ تعالی نے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو داعی بنا کر بھیجا تھا، ٹیکس وصول کرنے والا بنا کر نہیں بھیجا تھا۔إن الله إنما بعث محمداً صلى الله عليه وسلم داعياً ولم يبعثه جابيا (البداية والنهاية: 9/213)

عمر بن عبدالعزیز کے زمانے کے ایک اور گورنر عدی بن ارطاۃ نے اِس طرح کی شکایت کو لے کر خلیفہ کو لکھا— لوگ بڑی تعداد میں اسلام قبول کررہے ہیں۔مجھے ڈر ہے کہ اِس کے نتیجے میں حکومت کے مالیہ میں کمی ہوجائے گی (فإن الناس قد كثروا في الإسلام، خفت أن يقل الخراج)۔اِس کا جواب خلیفہ عمر بن عبدالعزیز نے اِن الفاظ میں دیا: والله لوددتُ أن الناس كلهم أسلموا، حتى نكون أنا وأنت حرّاثَين نأكل من كسب أيدينا (سيرة عمر بن عبد العزيز، لابن الجوزي: 124) یعنی خدا کی قسم، مجھے یہ پسند ہے کہ سارے لوگ اسلام قبول کرلیں، یہاں تک کہ میں اور تم دونوں کاشت کار بن جائیں اور اپنے ہاتھ کی محنت سے اپنا رزق حاصل کریں۔

یہ واقعہ بتاتا ہے کہ کلام میں وضوح (clarity) کس طرح پیدا ہوتی ہے۔کلام میں وضوح کا

رازیہ ہے کہ صاحب کلام کے اندر وہ صفت موجود ہو جس کو قرآن میں فرقان (8:29) کہا گیا ہے، یعنی چیزوں کو سارٹ آؤٹ (sort out) کرکے دیکھنا۔ ایک چیز کو دوسری چیز سے الگ کرکے رائے قائم کرنا۔ اِسی اصول تمیز (principle of differentiation) کا نام حکمت ہے اور اِس حکمت کا حامل کوئی شخص جب کلام کرے تو اس کا ذہن فطری طور پر چیزوں کی مختلف نوعیت کو جان لیتا ہے اور اس کے مطابق، کلام کرتا ہے۔ جس کلام میں یہ صفت پائی جائے اس کے اندر لازمی طور پر وضوح موجود ہوگا۔

اِس اعتبار سے، مذکورہ مثال پر غور کیجئے۔ اِس معاملے کا ایک پہلو یہ تھا کہ کثرتِ اسلام سے حکومت کا مالیہ کم ہو رہا تھا۔ اِس معاملے کا دوسرا پہلو یہ تھا کہ پیغمبر کا اصل مشن یہی تھا کہ لوگوں کو سچائی ملے۔ خلیفہ عمر بن عبدالعزیز نے دونوں پہلوؤں کو الگ کرکے دیکھا، اس لیے وہ ایک واضح اور درست رائے تک پہنچ گئے۔

اِس کے برعکس، ان کے دونوں گورنروں کا حال یہ تھا کہ وہ اِس صلاحیتِ فرقان کا ثبوت نہ دے سکے۔ اِس لیے انھوں نے ایک ایسی بات کہی جس میں وضوح موجود نہ تھا، اُن کے کلام میں مالیاتی پہلو کی اہمیت موجود تھی، لیکن اُن کے کلام میں دعوتی پہلو کی اہمیت مفقود ہوگئی تھی۔

خلیفہ عمر بن عبدالعزیز کے الفاظ بتاتے ہیں کہ اسلام میں کس چیز کو اصل اہمیت حاصل ہے۔ وہ یہی ہے کہ اپنے اندر مومنانہ شخصیت کی تعمیر کی جائے اور دوسروں کو اللہ کا پیغام پہنچایا جائے۔ معلوم ریکارڈ کے مطابق، اسلام کی بعد کی تاریخ میں دوبارہ کوئی ایسا شخص پیدا نہیں ہوا جو اِس حقیقت کا شعور رکھتا ہو اور کھلے طور پر اس کا اظہار کرے۔

حقیقت یہ ہے کہ وہ چیز جس کو حدیث میں فتنۂ دہیما کہا گیا ہے، اس کا زمانہ خلیفہ عمر بن عبدالعزیز کے بعد ہی شروع ہوگیا تھا۔ اِس کے بعد وہ بڑھتا رہا، یہاں تک کہ بیسویں صدی میں وہ اپنی کامل صورت میں پوری مسلم امت کے درمیان چھا گیا۔

دین کی تعبیر میں اختلاف

فتنہ دہیماء کیا ہے۔ فتنہ دہیماء کوئی پراسرار چیز نہیں۔ فتنہ دہیماء دراصل یہ ہے کہ قرآن کا

مرکزی مضمون لوگوں پر واضح نہ رہے اور لوگ اپنے اپنے مائنڈ سیٹ (mindset) کے تحت قرآن وسنت کی تشریح وتعبیر کرنے لگیں۔ اِس کے نتیجے میں افکار اور آرا کا اختلاف اتنا بڑھ جائے کہ اصل حقیقت اس کے اندر گم ہوجائے اور یہ معلوم کرنا سخت دشوار ہوجائے کہ وہ اصل دین کیا ہے جو اللہ نے اپنے پیغمبر کی طرف بھیجا تھا۔

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات سے تقریباً ایک سو سال بعد اسلام کی جو علمی تاریخ بنی، اس کے موضوعی مطالعہ (objective study) سے بخوبی طور پر یہ بات واضح ہوجاتی ہے کہ یہ واقعہ کیوں پیش آیا۔ عباسی دور میں یہ ہوا کہ دین کی اسپرٹ کے بجائے اس کے فارم کو لے کر ساری بحث ہونے لگی۔ فارم میں چوں کہ تعدد (diversity) تھا، اِس لیے فطری طور پر لوگوں کی تعبیرات میں بھی تعدد پیدا ہوگیا۔ اس کے بعد متن (text) کو لے کر یہ بحثیں شروع ہوئیں کہ کسی لفظ کا کیا مفہوم ہے۔ الفاظ میں بھی ہمیشہ ایک سے زیادہ مفہوم کی گنجائش ہوتی ہے، اس لیے یہاں بھی یہ واقعہ پیش آیا کہ معانی کا مفہوم متعین کرنے میں کثرت سے اختلافات پیدا ہوگئے۔ اِس طرح بعد کے زمانے میں دین کی مختلف تعبیرات کو لے کر الگ الگ گروہ بننے لگے، یہاں تک کہ حدیث کے الفاظ میں، امتِ مسلمہ 73 فرقوں میں، بلکہ اُس سے زیادہ فرقوں میں تقسیم ہوگئی۔ اِسی طرح سیاسی مفاد کے تحت لوگوں کے درمیان اختلافات پیدا ہوئے۔ ہر فریق اپنے موقف کو قرآن وحدیث سے جائز ثابت کرنے لگا۔ اِس صورتِ حال نے بھی تعبیراتِ دین میں اختلافات کا ایک جنگل پیدا کر دیا۔

بیسویں صدی عیسوی میں اِس صورت حال میں مزید اضافہ ہوا۔ یہ زمانہ وہ تھا جب کہ سیکولر نظام کے غلبے کے تحت مسلمانوں کے درمیان مختلف قسم کی تحریکیں برپا ہوئیں اور پریس کی طاقت کے تحت تیزی سے لوگوں کے درمیان پھیلیں۔ اِس زمانی اثر کے تحت مسلمانوں کے درمیان بھی مختلف قسم کی تحریکیں اٹھیں اور مختلف قسم کے نظریات کی اشاعت ہونے لگی۔ اِس طرح فکری اختلافات کا معاملہ اپنی کمیت کے اعتبار سے، بہت زیادہ بڑھ گیا۔ بیسویں صدی کے آخر میں فتنہ دہیماء کا کلچر اپنی آخری انتہا تک پہنچ گیا۔ اب یہ حالت ہوگئی کہ اگر کوئی شخص یہ جاننا چاہے کہ دینِ اسلام اپنی اصل حقیقت کے

اعتبار سے کیا ہے تو وہ یقین کے ساتھ کسی نتیجہ تک نہیں پہنچے گا۔

فتنہ دہیما یا ذہنی کنفیوزن کا یہ معاملہ اب اتنا بڑھ چکا ہے کہ اگر کوئی ایسا لٹریچر تیار ہو جو دینِ اسلام کو دوبارہ اس کے صحیح اسلوب میں بیان کرے، تب بھی عملاً وہ زیادہ مفید نہ ہوگا۔ صحیح لٹریچر کو عملی طور پر مفید بنانے کے لیے یہ بھی ضروری ہے کہ پچھلے ہزار سال کے دوران لکھی جانے والی کتابوں کو اسلام کے کتب خانے میں کلاسکل لٹریچر (classical literature) کی حیثیت سے محفوظ کر دیا جائے۔ اسلام کی شرح کے اعتبار سے، اس کی مستند حیثیت باقی نہ رہے۔

مقصدِ تخلیق

بعد کے دور میں جو فکری کنفیوزن (intellectual confusion) پیدا ہوا، اس کا اصل سبب یہ تھا کہ تعبیرات کے اختلاف کے درمیان یہ حقیقت گم ہوگئی کہ انسان کی تخلیق کا مقصد (purpose of life) کیا ہے۔ اِس حالتِ انتشار کو ختم کرنے کی صورت صرف یہ ہے کہ انسان کے مقصد تخلیق کو متعین کیا جائے۔ مقصد تخلیق کے تعین کے بعد ایسا نہیں ہوگا کہ اختلافات کا عملاً خاتمہ ہو جائے۔ جو واقعہ پیش آئے گا، وہ صرف یہ کہ اختلافات کی حیثیت ثانوی (secondary) بن جائے گی۔ اور اختلافات کا ثانوی بن جانا ہی اِس مسئلے کا عمومی حل ہے۔ اِس کے بعد فطری طور پر یہ ہوگا کہ لوگوں کا ذہنی فوکس بدل جائے گا۔ لوگوں کی ساری توجہ انسان کے اصل تخلیقی مقصد پر مرتکز ہو جائے گی۔

فوکس کے تعدد سے فکری انتشار پیدا ہوتا ہے اور فوکس کے توحد سے فکری اتفاق وجود میں آتا ہے (5 جنوری 2014)

واٹس ایپ پر روزانہ مولانا وحید الدین خاں کی حکمت اور نصیحت سے بھرپور مختصر گفتگو سننے کے لئے اپنا واٹس ایپ نمبر ذیل کے نمبر پر بھیجیں اور اس نمبر کو اپنے موبائل میں محفوظ (save) کر لیں:

+91-9999944119

شرحِ صدر کیا ہے

شرح صدر کا مطلب ہے، سینہ کھول دینا۔ عربی میں کہا جاتا ہے: شرح اللہ صدرہ بقبول الخیر فانشرح (اللہ نے اس کے سینے کو حق کی قبولیت کے لیے کھول دیا تو وہ کھل گیا)۔ یہ حق کے متلاشی (seeker) کا معاملہ ہے۔ حق کے متلاشی کو جب اللہ کی توفیق سے حق کی دریافت ہوجائے تو اس وقت اس کے دل کی جو مثبت کیفیت ہوتی ہے، اسی کو شرحِ صدر کہا گیا ہے۔

انسان فطری طور پر حق کا متلاشی (seeker of truth) ہے۔ وہ جاننا چاہتا ہے کہ حقیقت کیا ہے۔ وہ اپنی اور کائنات کی تخلیق کے راز کو سمجھنا چاہتا ہے۔ اس کی یہ جستجو جب اس حد کو پہنچے کہ سچائی اس کے لیے ایک خود دریافت کردہ حقیقت (self-discovered reality) بن جائے تو اس کے بعد فطری طور پر اس کو ایک ذہنی سکون (peace of mind) حاصل ہوجاتا ہے۔ اسی واقعہ کو شرح صدر سے تعبیر کیا گیا ہے۔

سچائی کو دریافت کرنا انسان کا سب سے بڑا کنسرن (concern) ہے۔ سچائی کو دریافت کرنے سے پہلے انسان ایک حیوان کی مانند ہوتا ہے۔ سچائی کو دریافت کرنے کے بعد انسان حقیقی معنوں میں انسان بن جاتا ہے۔ سچائی کی دریافت یہ ہے کہ انسان کو اپنے تمام سوالات کے جواب مل جائیں۔ وہ اپنے وجود کی معنویت سے باخبر ہوجائے۔ وہ جان لے کہ حقیقت کے اعتبار سے اس کی منزل کیا ہے۔ وہ راستہ کون سا ہے، جس کو اختیار کرکے وہ اس مقام پر پہنچ سکتا ہے، جو اس کی حقیقی منزل ہے۔

شرح صدر آدمی کو یقین (conviction) عطا کرتا ہے۔ شرح صدر کے بعد آدمی کنفیوزن (confusion) سے باہر آجاتا ہے۔ اس کی سوچ میں وضوح (clarity) پیدا ہوجاتی ہے۔ وہ اس قابل ہوجاتا ہے کہ وہ چیزوں کا صحیح تجزیہ (right analysis) کرسکے۔ وہ اس قابل ہوجاتا ہے کہ چیزوں کو صحیح زاویۂ نظر (right angle) سے دیکھنے لگے۔ شرح صدر کے بعد آدمی اس قابل ہوجاتا ہے کہ وہ اپنے خالق کو دریافت کرلے، اور اسی کے ساتھ اپنے آپ کو بھی۔

تربیت کا ٹکنکل طریقہ

آج کل تربیت کے بہت سے طریقے نکلے ہیں— پانچ دن کا مدرسہ، روزانہ ایک آیت، چالیس دن کا چلہ، پندرہ روزہ تربیتی کورس، وغیرہ۔ ان طریقوں کو ایک لفظ میں ٹکنکل طریقہ کہہ سکتے ہیں۔ یہ طریقے عوامی طور پر کافی مقبول ہیں۔ لیکن نتیجہ کے اعتبار سے وہ سب کے سب غیر مفید ہیں۔

ان تمام طریقوں میں ایک بات مشترک ہے۔ وہ یہ ہے کہ بظاہر دھوم کے باوجود ان طریقوں کے ذریعے کوئی انسان بن کر تیار نہیں ہوتا۔ اس کا سبب یہ ہے کہ انسان کی تربیت کبھی بھی مبنی بر روٹین عمل سے نہیں ہوتی۔ تربیت ہمیشہ ذہنی بیداری (intellectual awakening) کے ذریعے ہوتی ہے، نہ کہ کسی ٹکنکل طریقہ کو دہرانے سے۔

تربیت یہ ہے کہ آدمی کے اندر تخلیقیت (creativity) پیدا کی جائے۔ مسلسل ذہنی خوراک کے ذریعے انسان کو ایسا بنایا جائے کہ وہ خود اپنا مربی بن جائے۔ وہ خود اپنا محاسبہ کرے۔ وہ اپنے اندر اصلاح کا عمل جاری کرے۔ وہ خود اپنی کمیوں اور کوتاہیوں کو دریافت کرے۔ وہ خود مسلسل طور پر اپنا نگراں بن جائے۔

پیشہ ورانہ تربیت (professional training) کسی دوسرے شخص کے ذریعے ممکن ہے، لیکن دینی تربیت ایک ایسا کام ہے جو ہر آدمی کو خود کرنا پڑتا ہے۔ ہر آدمی کو خود یہ جاننا پڑتا ہے کہ کس موقع پر اس کو کیا سیکھنا ہے، کس موقع سے اس کو کیا تربیتی غذا لینا ہے، کس موقع پر اس کو کیا کرنا ہے اور کیا نہیں کرنا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ تربیت ایک دوامی عمل ہے۔ ہر لمحہ اپنے ساتھ تربیت کا ایک موقع لے کر آتا ہے۔ ہر آدمی کو خود یہ کرنا پڑتا ہے کہ وہ تربیت کے اس موقع کو پہچانے، اور اس کو اپنی اصلاح کے لیے استعمال کرے۔ تربیت ایک سیلف ٹریننگ (self-training) کا معاملہ ہے۔ اپنی تربیت آپ وہی شخص کر سکتا ہے، جس کے اندر دو صفت پیدا ہو جائے— محاسبہ اور تفکیر۔

صبر واعراض کا اصول

موجودہ زمانے میں مسلمان عام طور پر شکایت کی نفسیات میں جی رہے ہیں، وہ دوسری قوموں کو غیر بلکہ اپنا دشمن سمجھتے ہیں۔ ان کے مقررین ومحررین ہمیشہ دوسروں کے خلاف شکایت کی زبان استعمال کرتے ہیں۔ اگر ان سے کہا جائے کہ آپ ایسا کیوں کرتے ہیں تو ان کا جواب ہوگا:

Should you ignore Gujarat 2002, Assam, Muzaffarnagar, etc., or the umpteen fake terror cases/encounters or the daily conspiracies of the *Sangh Parivar* in so many ways that make life difficult for the Muslim community?

مگر اس معاملے میں قرآن کا جواب مختلف ہوگا، اور وہ یہ کہ آپ کو اِس قسم کے منفی واقعات کو نظر انداز ہی کرنا ہے۔ آپ کو اپنے مفروضہ دشمن کی نام نہاد سازشوں کو بھلا کر اپنی زندگی کو مثبت بنیاد پر تعمیر کرنا ہے۔ قرآن میں اس طریقے کو صبر واعراض کہا گیا ہے، اور صبر واعراض کے بغیر کوئی قوم اس دنیا میں ہرگز ترقی نہیں کرسکتی۔

اس سلسلہ میں قرآن کی ایک آیت یہ ہے: وَلَنَصْبِرَنَّ عَلَىٰ مَا آذَيْتُمُونَا (14:12) یعنی اور جو تکلیف تم ہمیں دوگے ہم اس پر صبر ہی کریں گے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اس دنیا کو بنانے والے نے اس کو آزادی اور مقابلہ (competition) کے اصول پر بنایا ہے۔ یہاں کوئی بھی نظام ہو، اور کسی کی بھی حکومت ہو، ہمیشہ ایک کو دوسرے سے کچھ نہ کچھ ایذاء (harm) کا تجربہ ہوگا۔ آدمی کو چاہئے کہ وہ اس قسم کے واقعات کو شکایت کا موضوع نہ بنائے بلکہ وہ اس کو مینیج (manage) کرنے کی تدبیر کرے۔

اسی طرح قرآن کی ایک آیت یہ ہے: وَإِن تَصْبِرُوا وَتَتَّقُوا لَا يَضُرُّكُمْ كَيْدُهُمْ شَيْئًا (آل عمران: 120) یعنی اگر تم صبر کرو اور اللہ سے ڈرو تو ان کی کوئی سازش تم کو نقصان نہ پہنچائے گی۔ اس کا مطلب ہے کہ فطرت کے نظام کے مطابق اس دنیا میں اصل مسئلہ سازش (conspiracy) کی موجودگی نہیں ہے، بلکہ اصل مسئلہ یہ ہے کہ لوگوں کے اندر صبر اور تقوی کی

صفت نہ پائی جائے۔ اس لئے سازش کے خلاف شکایت کرنا مکمل طور پر ایک بے فائدہ کام ہے۔ کرنے کا اصل کام یہ ہے کہ لوگوں کے اندر صبر اور تقوی کی صفت پیدا کی جائے تاکہ سازش کرنے والوں کی سازش عملاً موثر نہ ہو سکے۔

قرآن کی تعلیمات کا ایک پہلو یہ ہے کہ وہ انسان کو یہ بتاتا ہے کہ انسان کے بارے میں خالق کا تخلیقی منصوبہ (creation plan) کیا ہے۔ انسان کو چاہئے کہ وہ اس تخلیقی منصوبہ کو جانے، اور اس کے مطابق اپنی سرگرمیوں کا نقشہ بنائے۔ کوئی فرد یا کوئی قوم اگر اس تخلیقی منصوبے کو نظر انداز کرے اور خود اپنے ذہن کے مطابق اپنے عمل کا منصوبہ بنائے تو یقینی طور پر اس دنیا میں اس کا منصوبہ ناکام ہو جائے گا۔ یہی حقیقت پسندی ہے، اور اس دنیا میں حقیقت پسندی ہی سب سے بڑا اصول ہے۔

قرآن میں انسان کی پیدائش کی حکمت کو ان الفاظ میں بیان کیا گیا ہے: الَّذِي خَلَقَ الْمَوْتَ وَالْحَيَاةَ لِيَبْلُوَكُمْ أَيُّكُمْ أَحْسَنُ عَمَلًا (67:2) یعنی اللہ نے موت اور زندگی کو پیدا کیا تاکہ وہ تم کو جانچے کہ تم میں سے کون اچھے عمل والا ہے۔ اس حکمت ابتلا کی بنا پر، ہر انسان کو کامل آزادی دی گئی ہے۔ جب انسان اپنی آزادی کو اپنی مرضی کے مطابق استعمال کرتا ہے تو اس سے فطری طور پر دنیا میں چیلنج اور مسابقت (competition) کا ماحول پیدا ہوتا ہے۔

چیلنج اور مسابقت کا یہ ماحول لازماً دنیا میں رہے گا۔ اس بنا پر یہاں لازماً ایسا ہوگا کہ ایک کو دوسرے کی طرف سے غیر مطلوب صورت حال (unwanted situation) کا سامنا پیش آئے گا۔ اس صورت حال کے خلاف شکایت کرنا بھی بے فائدہ ہے، اور اس سے لڑنا بھی بے فائدہ۔ کامیابی کا طریقہ یہ ہے کہ آدمی حکیمانہ تدبیر کے ساتھ اس کا سامنا کرے۔ خالق کے قائم کردہ نظام کے مطابق اس دنیا میں کامیابی کا یہی واحد اصول ہے۔

اسی حکیمانہ روش کا نام صبر و اعراض ہے۔ صبر و اعراض دانش مندانہ طریقِ زندگی کا دوسرا نام ہے۔ صبر و اعراض اپنی حقیقت کے اعتبار سے اقدام ہے، اگرچہ نادان لوگ اس کو پسپائی سمجھ لیتے ہیں۔ صبر و اعراض اعلیٰ انسانی اخلاق کا دوسرا نام ہے۔

توحید اور عدل

اسلام کے دو بنیادی اصول ہیں— توحید اور عدل۔ توحید کا مطلب ہے خالق کو ہر اعتبار سے ایک ماننا۔ کسی بھی اعتبار سے کسی اور کو اس کا شریک (partner) نہ بنانا۔ عدل کا مطلب ہے معاملات میں انصاف (justice) کا طریقہ اختیار کرنا۔ کسی بھی عذر (excuse) کی بنا پر انصاف کے طریقے سے نہ ہٹنا۔ اس انصاف کا تعلق انسان کے قول سے بھی ہے، اور اس کے عمل سے بھی۔

توحید اور عدل دونوں لازم کے معنی میں ہیں، ان میں سے کوئی بھی متعدی کے معنی میں نہیں۔ یعنی دونوں کا تعلق فرد کے رویہ سے ہے۔ فرد سے یہ مطلوب ہے کہ وہ کامل معنوں میں موحّد بنے، اس کی آئڈیالوجی مکمل طور پر توحید (oneness of God) پر مبنی ہو۔ عدل کا مطلب ہے ایک فرد کا انصاف پر قائم ہونا۔ اس کا قول منصفانہ قول ہو، اس کا عمل تمام تر انصاف پر مبنی ہو۔ توحید کا لفظ انسان کے عقیدہ (belief) کو بتاتا ہے، اور عدل کا لفظ انسان کے سماجی رویہ (social behaviour) کو۔

یہ دونوں الفاظ پیروی کے معنی میں ہیں، نہ کہ نفاذ کے معنی میں۔ جس طرح توحید ذاتی طور پر اختیار کرنے کی چیز ہے، وہ دوسروں کے اوپر نافذ (impose) کرنے کی چیز نہیں۔ یہی معاملہ عدل کا بھی ہے۔ عدل کا مطلب بھی یہی ہے کہ آدمی جن انسانوں کے درمیان رہتا ہے، ان کے ساتھ وہ ہمیشہ انصاف کا طریقہ اختیار کرے، وہ ہر حال میں ناانصافی سے بچے۔

اسلامی مشن کا نشانہ فرد (individual) ہے، نہ کہ نظام (system)۔ اسلام کا مقصد انسان کو اسلامائز کرنا ہے، نہ کہ سسٹم کو اسلامائز کرنا۔ اس دنیا کے خالق نے انسان کو امتحان (test) کے لیے پیدا کیا ہے۔ ہر آدمی کا یہ امتحان ہے کہ وہ اپنی آزادی کو کس طرح استعمال کرتا ہے، صحیح طور پر یا غلط طور پر۔ اگر اسلام کی تعلیمات کو طاقت کے ذریعے بزور نافذ کیا جائے تو امتحان کا ماحول ختم ہو جائے گا۔ امتحان کا مقصد صرف اس وقت پورا ہو سکتا ہے، جب کہ لوگوں کو آزادی ہو، اور یہ دیکھا جا سکے کہ انھوں نے اپنی آزادی کا صحیح استعمال کیا یا غلط استعمال کیا۔

زمین میں خلافت

قرآن میں بتایا گیا ہے کہ اللہ نے جب انسان کو پیدا کرنے کا ارادہ کیا تو فرمایا: إِنِّي جَاعِلٌ فِي الْأَرْضِ خَلِيفَةً (2:30) یعنی میں زمین میں ایک خلیفہ بنانے والا ہوں۔ خلیفہ کا مطلب جانشین یا قائم مقام (successor) ہے، یعنی کسی کی جگہ لے کر اس کی طرف سے اس کا کام کرنے والا۔ اس تشریح کے مطابق اس آیت میں خلیفہ سے مراد خلیفۃ اللہ فی الارض، یعنی زمین میں اللہ کا خلیفہ ہے۔

خلیفہ ایک انسانی زبان کا لفظ ہے۔ انسانی تصور کے مطابق خلیفہ کا مطلب یہ ہے کہ ایک انسان کی وفات کے بعد دوسرا انسان اس کی جگہ آ کر اس کی قائم مقامی کرے۔ خلیفہ کا یہ مفہوم انسان کے اعتبار سے ہے۔ جب یہ لفظ اللہ کی نسبت سے بولا جائے تو یہاں موت کے بجائے غیب مراد ہوگا۔ اس کا مطلب یہ ہوگا کہ اللہ جو غیب میں ہے اس کی نمائندگی شہود میں کرنا۔ اس آیت میں خلافت یا نمائندگی سے مراد سیاسی نمائندگی نہیں ہے۔ اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ انسان اللہ کا نائب بن کر زمین پر اللہ کی حکومت قائم کرے۔ یہ خلافت اعلان حق کے معنی میں ہے، نہ کہ تنفیذ احکام کے معنی میں۔ اس اعلان سے مراد وہی چیز ہے، جس کو فرشتوں نے تحمید اور تقدیس (2:30) کے الفاظ میں بیان کیا تھا۔ اللہ کی تحمید اور تقدیس ایک اعلیٰ ترین مقصود ہے جس کو کائنات کی ہر چیز ودیعۃً (inherently) کر رہی ہے۔ اب اللہ کو منظور ہوا کہ یہ کام انسان ذاتی دریافت (self discovery) کے طور پر کرے۔

کائنات میں انسان ایک خصوصی تخلیق کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس حقیقت کو قرآن میں ان الفاظ میں بتایا گیا ہے کہ مستقبل میں اللہ کی آیات کی تبیین آفاق و انفس (43:53) کی زبان میں کی جائے گی۔ اللہ کو مطلوب تھا کہ ایک مخلوق ہو جو ذاتی دریافت کی سطح پر اس تحمید و تقدیس کا اظہار کرے۔

تحمید و تقدیس سے مراد محض تعریف نہیں ہے، بلکہ کائنات کی سطح پر حقیقت ربانی کا اعلان کرنا ہے، یعنی تخلیق (creation) کو خالق کے خانے میں ڈالنا۔ براہ راست طور پر یہ کام مومن کو انجام دینا ہے، لیکن بالواسطہ طور پر ساری انسانیت کو اس کے حق میں تائیدی رول ادا کرنا ہے، حتی کہ غیر اہل ایمان کو بھی۔

ٹیم کی تربیت

پیغمبرِ اسلام صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے آخری زمانے میں حضرت ابوبکر کو نماز باجماعت کا امام بنایا۔ ایک روایت کے مطابق آپ نے 17 بار ایسا کیا، اور دوسری روایت کے مطابق آپ نے 20 بار ایسا کیا (البدایۃ والنہایۃ لابن کثیر: 5/235، دارالفکر، بیروت، 1978)۔ یہ فضیلتِ ابوبکر کا معاملہ نہ تھا۔ بلکہ یہ حکمت کی ایک بات تھی۔ اس سے ایک اہم اصول معلوم ہوتا ہے۔ یہ ایک عام اصول ہے۔ اس کا انطباق (application) پیغمبر کے جاری کیے ہوئے مشن پر بھی ہوتا ہے، اور اسی طرح غیر پیغمبر کے جاری کیے ہوئے مشن پر بھی۔ یہ فطرت کا ایک قانون ہے۔ اور فطرت کا قانون ہمیشہ آفاقی ہوتا ہے۔

کسی مشن کا جو بانی ہوتا ہے، وہ فطری طور پر اس کا قائد (leader) بن جاتا ہے۔ اگر یہ قائد اچانک دنیا سے چلا جائے تو مشن کے اندر ایک ناقابلِ تلافی خلا ہو جائے گا۔ لوگ محسوس کریں گے کہ ٹیم بے قائد (leaderless) ہو گئی ہے۔ اس لیے قائد کو چاہئے کہ وہ اپنے آخری زمانے میں خاموشی کے ساتھ اس پہلو سے ٹیم کی تربیت کرے۔ وہ ٹیم کو اس قابل بنائے کہ قائد جب درمیان سے ہٹ جائے تو ٹیم کی اجتماعیت میں کوئی کمزوری نہ پیدا ہو۔ مشن کی سرگرمیاں قائد کے بعد بھی بدستور اسی طرح جاری رہیں، جس طرح وہ قائد کی موجودگی میں جاری تھیں۔

دانش مند قائد کو چاہئے کہ وہ اپنی موجودگی میں اس اعتبار سے ٹیم کو تیار کرے۔ وہ ٹیم کو بار بار یہ موقع دے کہ وہ قائد کی مقامی غیر موجودگی کے باوجود مشن کی سرگرمیوں کو انجام دے سکے۔ یہ گویا بالواسطہ قیادت کا طریقہ ہے۔ قائد اگر ٹیم کے درمیان موجود ہو تو وہ براہ راست طور پر اس کی قیادت کرے گا۔ اگر وہ ٹیم کے درمیان موجود نہیں ہے تو گویا کہ وہ بالواسطہ طور پر ٹیم کی قیادت کر رہا ہے۔ یہ ایک حکیمانہ طریقہ ہے۔ قائد اور ٹیم دونوں کو اس حکمت سے باخبر ہونا چاہئے۔ تربیت ایک شعوری واقعہ کا نام ہے، بے شعوری کے ساتھ کسی ٹیم کی تربیت نہیں ہو سکتی۔

دعوت کی ذمے داری

ایک صاحب برطانیہ سے اپنے مکتوب میں لکھتے ہیں:

آج میں نے مئی 2015 کا اردو الرسالہ انٹرنیٹ پر پڑھنا شروع کیا تو میری نظر ایک مضمون ''مدعو داعی کے دروازے پر'' (صفحہ 11) پر پڑی۔ یہ پڑھتے ہوئے مجھے اپنا ایک واقعہ یاد آ گیا جو آپ تک پہنچانا چاہتا ہوں۔ تین سال پہلے مجھے اپنے چند دوستوں کے ساتھ یونان کے ایک شہر کوس (Kos) کی سیاحت کا موقع ملا۔ کوس میں ہم لوگوں کو ایک تاریخی مسجد دکھائی دی تو نماز کے ارادے سے ہم لوگ اس میں داخل ہوئے۔ ہم نے دیکھا کہ وہاں کافی تعداد میں غیر مسلم مسجد کی وزٹ کے لیے داخل ہو رہے ہیں۔ پھر ادھر ادھر کچھ دیکھ کر نکل جاتے ہیں۔ میں نے وہاں یہ دیکھا کہ مسجد کے امام صاحب وہاں بیٹھے قرآن کی تلاوت کر رہے ہیں اور ان کو اس بات کا بالکل احساس نہیں کہ کون آیا کون گیا۔ مجھے یہ دیکھ کر بہت دکھ ہوا کہ غیر مسلم خود یہاں آتے ہیں لیکن ہم اپنی بے شعوری کی بنا پر ان کو کچھ پیش نہیں کر پاتے۔ میں اکثر یہ واقعہ یاد کر کے دکھی ہوتا ہوں اور آج پھر آپ کا مضمون پڑھ کر مجھے پورا منظر یاد آ گیا۔ کاش! مسلمان اس کو سمجھ سکتے اور اپنی دعوتی ذمے داری کو ادا کرتے۔ (ایم حنیف، پرسٹن، برطانیہ)

یہ صرف ایک شہر کی بات نہیں ہے۔ یہی معاملہ پوری دنیا کا ہے۔ موجودہ زمانے میں مسلمان تقریباً ہر ملک میں بسے ہوئے ہیں۔ ہر جگہ بڑی تعداد میں سیاح (tourist) آتے ہیں۔ اس طرح ساری دنیا میں مسلمانوں کو یہ موقع ہے کہ وہ اپنی دعوتی ذمے داری کو ادا کریں، اور اللہ کا پیغام تمام انسانوں تک پہنچائیں۔

اس دعوتی ذمے داری کو ادا کرنے کی سب سے آسان صورت یہ ہے کہ ہر مسلمان قرآن کا ترجمہ اور اسلامی لٹریچر اپنے بیگ میں رکھے۔ ہر بار جب اس کا سامنا کسی انسان سے ہو تو وہ اس کو قرآن کا ترجمہ اور اسلامی لٹریچر پیش کرے۔ اس معاملے میں اسلامی لٹریچر کی حیثیت سپورٹنگ لٹریچر کی ہے۔

فطرت کا ایک قانون

قرآن کی سورہ نمبر 43 میں فطرت کا ایک قانون بیان کیا گیا ہے۔ وہ آیت یہ ہے: أَهُمْ يَقْسِمُونَ رَحْمَتَ رَبِّكَ نَحْنُ قَسَمْنَا بَيْنَهُمْ مَعِيشَتَهُمْ فِي الْحَيَاةِ الدُّنْيَا وَرَفَعْنَا بَعْضَهُمْ فَوْقَ بَعْضٍ دَرَجَاتٍ لِيَتَّخِذَ بَعْضُهُمْ بَعْضًا سُخْرِيًّا وَرَحْمَتُ رَبِّكَ خَيْرٌ مِمَّا يَجْمَعُونَ (الزخرف:32) کیا یہ لوگ تیرے رب کی رحمت کو تقسیم کرتے ہیں۔ دنیا کی زندگی میں ان کی روزی کو تو ہم نے تقسیم کیا ہے اور ہم نے ایک کو دوسرے پر فوقیت دی ہے تاکہ وہ ایک دوسرے سے کام لیں۔ اور تیرے رب کی رحمت اس سے بہتر ہے جو یہ جمع کر رہے ہیں۔

اس کا مطلب یہ ہے کہ انسان کی تخلیق میں یکسانیت (uniformity) نہیں رکھی گئی ہے۔ بلکہ انسانوں کی تخلیق تفاوت (disparity) کی بنیاد پر کی گئی ہے۔ یعنی کسی انسان کے اندر ایک خصوصیت، اور دوسرے انسان کے اندر دوسری خصوصیت ۔ اس تفاوت کی ایک حکمت ہے۔ اس تفاوت کا مقصد دنیا میں انسان کی اجتماعی زندگی کو باہمی انحصار (interdependence) کے اصول پر قائم کرنا ہے۔ یعنی ایک کا کام دوسرے پر منحصر ہونا۔ ایسا اس لیے کیا گیا ہے کہ لوگ اجتماعی زندگی میں مل جل کر رہیں۔ لوگ ایک دوسرے کے رقیب (rival) نہ بنیں، بلکہ وہ ایک دوسرے کے معاون (supporter) بن کر زندگی گزاریں۔

باہمی انحصار کا یہ معاملہ کسی محدود معنی میں نہیں ہے۔ وہ زندگی کے تمام پہلوؤں پر حاوی ہے۔ حتی کہ اس میں سیاست اور حکومت بھی شامل ہے۔ ایسی حالت میں سیاسی اپوزیشن (political opposition) کی پالیسی فطرت کے قانون کے خلاف ہے۔ اس کے بجائے جو چیز مطلوب ہے، وہ یہ کہ سیاسی معاونت (political cooperation) کا مزاج۔ یعنی اگر ایک شخص کو پولیٹیکل اتھاریٹی کا درجہ حاصل ہوتا ہے تو دوسرے لوگ اس سے اس کی اتھاریٹی کو چھیننے کی کوشش نہ کریں، بلکہ اس کی اتھاریٹی کو مانتے ہوئے اس کے ساتھ تعاون کا معاملہ کریں، نہ کہ رقابت کا معاملہ۔

مدعوفرینڈلی روش

قرآن میں دعوت الی اللہ کے کام کو تجارت سے تشبیہ دی گئی ہے۔ تجارت کا یہ معاملہ داعی اور مدعو کے درمیان ہوتا ہے۔ یہ تشبیہ نہایت بامعنی ہے۔ تجارت کا اصول یہ ہے کہ تاجر اپنے گاہک کے ساتھ کسٹمر فرینڈلی (customer friendly) روش اختیار کرے۔ ٹھیک یہی اصول کامیاب دعوت الی اللہ کا بھی ہے۔ حقیقی داعی وہ ہے جو اپنے مدعو کے ساتھ مدعوفرینڈلی روش اختیار کرے۔ دعوت صرف اعلان (announcement) نہیں ہے۔ دعوت ایک خیرخواہانہ عمل کا نام ہے۔ دعوت کی کامیابی کے لئے لازمی طور پر ضروری ہے کہ داعی اپنے مدعو کے لئے یک طرفہ طور پر خیرخواہ ہو۔ وہ شکایت کے اسباب کے باوجود کامل طور پر بے شکایت ہوجائے۔

دعوت الی اللہ اہل ایمان کا سب سے بڑا فریضہ ہے۔ دعوت الی اللہ گویا خاتم النبیین کی جانشینی ہے۔ دعوت الی اللہ کا کام کیے بغیر کسی مومن کے لیے پیغمبر کا امتی ہونا مشتبہ ہوجاتا ہے۔ دعوت الی اللہ کا مطلب پیغمبر کی غیر موجودگی میں پیغمبر کی ذمہ داری کو نیابتاً ادا کرنا ہے۔ یہ بعد کی انسانی نسلوں کے لیے پیغمبرانہ ذمے داری کی ادائیگی ہے۔ یہ گویا پیغمبر کے بعد پیغمبر کی جانشینی ہے۔

پیغمبر نے دعوت کا کام کامل نصح (خیرخواہی) کے ساتھ انجام دیا۔ یہی بعد کے زمانے کے داعیوں کو کرنا ہے۔ دعوت کا کام درست طور پر اسی وقت انجام دیا جاسکتا ہے، جب کہ داعی کے اندر مدعو کے لیے خیرخواہی کی اسپرٹ پائی جاتی ہو۔ داعی کے اندر اگر مدعو کے لیے خیرخواہی موجود نہ ہو تو وہ مدعو کی نظر میں ایک پروفیشن بن جائے گا۔ اور پروفیشن کے طور پر کیا ہوا کام کبھی مدعو کے لیے موثر (effective) نہیں ہوسکتا۔ خیرخواہی کا مطلب یہ ہے کہ داعی کامل طور پر بے شکایت ہو۔ اس کے دل میں مدعو کے لیے منفی جذبات نہ پائے جاتے ہوں۔ مدعو کی طرف سے اگر کوئی تکلیف یا دل آزاری کا معاملہ پیش آئے تب بھی داعی کو چاہیے کہ وہ یک طرفہ طور پر مدعو کے لیے اپنی خیرخواہی کو برقرار رکھے۔ داعی کو اپنے دعوتی عمل کا اجر اللہ سے لینا ہے نہ کہ انسان سے۔ داعی کے اندر اگر یہ ذہن موجود ہو تو مدعو کے بارے میں اس کی خیرخواہی کبھی ختم ہونے والی نہیں۔

فکر کی تشکیل

ایک شاعر نے لکھا:

ہے داد کے قابل میری تجریدِ تصور　　کرتا ہوں تجھے غیر کی محفل سے جدا یاد

تجریدِ تصور کا مطلب ہے فکری یکسوئی (detached thinking)۔ یعنی غیر متعلق باتوں سے اپنے کو الگ کر کے صرف مطلوب بات پر دھیان دینا۔ یہ انسان کی ایک امتیازی صفت ہے۔ یہ صفت جس طرح دنیا کے معاملے میں مطلوب ہے، اسی طرح وہ دین کے معاملے میں بھی صحتِ فکر کے لیے مطلوب ہے۔ جو شخص اس صفت کا حامل ہو، اس کے اندر وہ چیز پائی جائے گی جس کو صحتِ فکر کہا جاتا ہے۔

اصل یہ ہے کہ معاشرہ میں جس بات کا چرچا ہو، لوگ اسی کو لے کر اظہارِ رائے کرنے لگتے ہیں۔ اس سے لوگوں کے اندر متاثر ذہن بنتا ہے۔ مثال کے طور پر اسلامی تاریخ کے ابتدائی دور میں غزوات پیش آئے۔ اس لیے معاشرے میں غزوات کا چرچا ہونے لگا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اسلام کے ابتدائی دور میں سیرت پر جو کتابیں لکھی گئیں وہ سب غزواتی پیٹرن پر لکھی گئیں۔ اس کے بعد جب ماس کنورژن (mass conversion) ہوا تو لوگ دینی مسائل جاننے کی کوشش کرنے لگے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ معاشرے میں مسائل کا چرچا کرنے لگا۔ چناں چہ فقہ کی کتابیں مسائل کے پیٹرن میں لکھی جانے لگیں۔ اس کے بعد سیاسی حکومتوں کا دور شروع ہوا تو معاشرے میں سیاست کا چرچا ہونے لگا۔ اب تاریخ کی کتابیں سیاسی پیٹرن پر لکھی جانے لگیں۔ اس کے بعد جب نوآبادیات کا دور آیا تو مسلمانوں کے اندر قابض طاقتوں کے خلاف چرچا ہونے لگا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اب جو کتابیں لکھی گئیں، وہ سب ردعمل یا منفی سوچ کے پیٹرن پر لکھی گئیں۔ موجودہ زمانہ میڈیا کا زمانہ ہے۔ میڈیا ہاٹ نیوز (hot news) کی انڈسٹری ہے۔ اس لیے اب ہر مجلس میں اور ہر اجتماع میں یہی پیٹرن رائج ہو گیا ہے۔

ایسی حالت میں کسی مومن کے اندر صحیح اسلامی فکر کا بننا صرف اس وقت ممکن ہے جب کہ اس کے اندر تجریدی تصور کی صلاحیت ہو۔ وہ گرد و پیش کے چرچا سے اوپر اٹھ کر خود اپنی سوچ کے تحت اپنی رائے بنائے۔ وہ اپنے اندر، غیر متاثر ذہن کی تشکیل کرے۔

اسلام اور دورِ جدید

موجودہ زمانہ میں نظری اور عملی اعتبار سے بہت سی تبدیلیاں وقوع میں آئی ہیں۔ اس بنا پر موجودہ زمانہ کو نیا زمانہ کہا جاتا ہے۔ بیسویں صدی اس نئے زمانہ کا نقطۂ انتہا ہے۔ اس زمانہ میں ایک نیا ظاہرہ پیدا ہوا جس کو جدید ذہن (modern mind) کہا جاتا ہے۔ اس صورت حال کی بنا پر یہ ضرورت پیش آئی کہ جدید ذہن کے لئے اسلام کو قابل فہم (understandable) بنایا جائے۔ اس مقصد کے لیے مسلم اہلِ علم نے مختلف زبانوں میں کئی کتابیں تیار کیں۔ انھی میں سے ایک مشہور کتاب ڈاکٹر محمد اقبال (وفات: 1938) کی ہے، جو خاص اسی موضوع پر لکھی گئی ہے۔ یہ کتاب اس موضوع پر مصنف کے انگریزی خطبات کا مجموعہ ہے۔ اس کتاب کا نام یہ ہے:

The Reconstruction of Religious Thought in Islam

مگر عجیب بات ہے کہ یہ کتاب اپنے قاری کو کنفیوزن کے سوا کچھ اور نہیں دیتی۔ کتاب کے مضامین اتنے زیادہ غیر واضح ہیں کہ کوئی شخص یہ نہیں بتا سکتا کہ اس کتاب کا خلاصہ کیا ہے۔ حتی کہ کتاب کا ٹائٹل (The Reconstruction of Religious Thought in Islam) خود بھی ایک غیر واضح ٹائٹل ہے۔ اردو میں اس کا ترجمہ یہ ہوگا — الہیاتی افکار کی تشکیل جدید۔ مگر یہ ٹائٹل نہ انگریزی میں قابلِ فہم ہے اور نہ اردو ترجمہ میں قابلِ فہم۔

ڈاکٹر محمد اقبال کی مذکورہ کتاب میں یہ کنفیوزن کیوں پایا جاتا ہے۔ یہ کوئی اتفاقی بات نہیں۔ بلکہ اس کا ایک معلوم سبب ہے۔ اس معلوم سبب کو لے کر سمجھنے کی کوشش کی جائے تو آسانی کے ساتھ مذکورہ کتاب کے مندرجات میں کنفیوزن کا سبب دریافت کیا جا سکتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ ڈاکٹر محمد اقبال اصلاً ایک فلسفی آدمی تھے۔ انھوں نے قدیم فلسفہ کو بطور سبجیکٹ پڑھا تھا اور اس کا مطالعہ کیا تھا۔ اس تعلیمی پس منظر کی بنا پر ان کے ذہن میں جو ماڈل بنا وہ فلسفیانہ ماڈل تھا۔ وہ چیزوں کو اپنے اسی فلسفیانہ ماڈل کی روشنی میں دیکھتے تھے۔ وہ اپنے مخصوص شاکلہ کی بنا پر ہر چیز کو اسی فلسفیانہ ماڈل میں ڈھالتے

رہے۔ مگر فلسفیانہ ماڈل ایک انسان ساز (man-made) ماڈل ہے جب کہ اسلام اس معنی میں کوئی فلسفیانہ مذہب نہیں۔ اسلام فطرت خداوندی پر مبنی ایک مذہب ہے۔

اسلام کی آئیڈیالوجی اور اس کی تعلیمات فطرت خداوندی کے اصولوں پر مبنی ہیں۔ اس حقیقت کا اعلان قرآن میں ان الفاظ میں کیا گیا ہے: فِطْرَتَ اللَّهِ الَّتِي فَطَرَ النَّاسَ عَلَيْهَا (30:30) اسی طرح فرمایا کہ يُدَبِّرُ الْأَمْرَ يُفَصِّلُ الْآيَاتِ (13:2)۔

ڈاکٹر محمد اقبال کی غلطی یہ ہے کہ انھوں نے اپنے فلسفیانہ ماڈل کو شعوری یا غیر شعوری طور پر معیاری ماڈل سمجھ لیا اور اسی فلسفیانہ ماڈل کے مطابق اسلام کی تشریح کرنے لگے۔ چونکہ فطرت کا ماڈل الگ ہے اور فلسفہ کا ماڈل الگ۔ اس فرق کی بنا پر اقبال کے بیانات میں کنفیوزن پیدا ہو گیا۔

اس معاملہ کی ایک مثال یہ ہے کہ ڈاکٹر محمد اقبال نے قرآن کے جنت اور جہنم کے تصور کو واضح کرنے کی کوشش کی تو جنت اور جہنم کو اپنے اختیار کردہ فلسفیانہ ماڈل میں ڈھال دیا۔ چنانچہ انھوں نے لکھا ہے کہ جنت اور جہنم احوال ہیں، وہ مقامات نہیں:

Heaven and Hell are states, not localities.

اقبال کے اس بیان میں ایک فطری حقیقت کو فلسفیانہ ماڈل میں ڈھالنے کی کوشش کی گئی ہے۔ یہ ایک عدم مطابقت کا معاملہ ہے۔ اسی عدم مطابقت نے اقبال کے بیان میں کنفیوزن پیدا کر دیا۔

اِس نوعیت کی ایک اور مثال حال میں سامنے آئی ہے۔ ایک معاصر مسلم دانشور جنھوں نے اعلی تعلیم حاصل کی، وہ عربی اور انگریزی دونوں زبانوں میں بخوبی دستگاہ رکھتے ہیں۔ انھوں نے اپنے بیان کے مطابق ستر سال سے زیادہ مدت تک اسلامیات کا مطالعہ کیا ہے۔ ایک سیمینار میں انھوں نے اِس موضوع پر ایک مقالہ پیش کیا۔ یہ مقالہ ایک مسلم میگزین میں چھپا ہے۔ اور اس کا عنوان یہ ہے:

علم: اسلامائزیشن سے تخلیق کی طرف

یہ عنوان بالکل غیر واضح عنوان ہے۔ اسی طرح اِس مقالے کے بیانات میں بھی وضوح (clarity) موجود نہیں۔ میں نے کئی تعلیم یافتہ لوگوں کو ان کا مقالہ پڑھوایا اور پوچھا کہ اس کا خلاصہ کیا

ہے۔ ہر ایک کا جواب یہ تھا کہ ہم کو اِس میں کنفیوزن کے سوا اور کچھ نہیں ملا۔

مصنف نے اپنے اس مقالے میں کہا ہے کہ آج ہم کو تخلیقِ علم (knowledge creation) کی ضرورت ہے۔ لیکن پورے مقالے میں انھوں نے یہ نہیں بتایا کہ اُن کے نزدیک تخلیق علم کی تعریف (definition) کیا ہے۔ قاری پورے مقالے کو اس طرح پڑھتا ہے کہ اس میں ''تخلیق علم'' کا لفظ تو بار بار استعمال ہوا ہے، لیکن قاری کو نہیں معلوم کہ اس اصطلاح کا واقعی مفہوم کیا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ تخلیق علم کوئی معروف اصطلاح نہیں۔ جاپان کے ایک شخص نے غالباً پہلی بار تخلیقِ علم کی اصطلاح وضع کی۔ وہ اس کو کمپنی کے معاملات کے لیے استعمال کرنا چاہتا تھا، لیکن خود اس جاپانی شخص کے ذہن میں بظاہر اس اصطلاح کا کوئی واضح تصور موجود نہ تھا۔ چنانچہ یہ اصطلاح اپنے عدم وضوع کی بنا پر عمومی طور پر مقبول نہ ہوسکی۔ اس موضوع پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اسلام کی جدید وضاحت کے لیے جو کام مطلوب ہے، وہ نہ ''ری کانسٹرکشن'' کا کام ہے اور نہ ''تخلیقِ علم'' کا کام۔ یہ وہی کام ہے جس کے لیے حدیث میں اجتہاد کا لفظ استعمال ہوا ہے۔ جدید ذہن کو ایڈریس کرنے کے لیے آج جس چیز کی ضرورت ہے، وہ یہی اجتہاد ہے، نہ کہ ری کانسٹرکشن اور تخلیقِ علم۔

اجتہاد کیا ہے۔ اجتہاد دراصل تطبیقِ نو (reapplication) کا دوسرا نام ہے۔ قرآن اور حدیث میں جو باتیں کہی گئی ہیں، وہ اپنے اسلوب کے اعتبار سے زمانی ہیں، لیکن تطبیق کے اعتبار سے وہ ابدی ہیں۔ اِس حقیقت کو دریافت کرنے کا نام اجتہاد ہے۔ اِس معاملے کی وضاحت کے لیے یہاں قرآن سے کچھ مثالیں درج کی جاتی ہیں:

1۔ قرآن کی سورہ العنکبوت میں ایک آیت اِن الفاظ میں آئی ہے: قُلْ سِيرُوا فِي الْأَرْضِ ثُمَّ انظُرُوا كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الْمُكَذِّبِينَ (6:11)

قرآن کی اِس آیت میں "سیر فی الأرض" کا لفظ استعمال ہوا ہے۔ یہ آیت ساتویں صدی کے نصف اول میں اتری، جب کہ دنیا میں پرنٹنگ پریس کا زمانہ نہیں آیا تھا۔ اِسی طرح اس وقت قوموں کے عروج وزوال کی تاریخ کے بارے میں کتابیں مرتب نہیں ہوئی تھیں۔ اب یہ سب کچھ

ہو چکا ہے۔ اِس لیے قرآن کی اِس آیت کی تفسیر اِس طرح کی جائے گی کہ قوموں کی تاریخ کا مطالعہ کرو اور اس سے سبق حاصل کرو۔ اِس مطالعے سے معلوم ہوگا کہ ہر قوم عروج کے بعد زوال کا شکار ہوتی ہے، یہ تاریخی ظاہرہ اس بات کا ثبوت ہے کہ تاریخ کو کنٹرول کرنے والا انسان نہیں، بلکہ ایک اور بالاتر عامل ہے جو انسانی تاریخ کو کنٹرول کر رہا ہے۔

2۔ اِسی طرح قرآن کی ایک اور آیت یہ ہے: وَالْخَيْلَ وَالْبِغَالَ وَالْحَمِيرَ لِتَرْكَبُوهَا وَزِينَةً وَيَخْلُقُ مَا لَا تَعْلَمُونَ (16:8) یعنی اور اس نے گھوڑے اور خچر اور گدھے پیدا کئے تاکہ تم ان پر سوار ہو اور زینت کے لئے بھی اور وہ ایسی چیزیں پیدا کرتا ہے جو تم نہیں جانتے۔

قرآن کی اِس آیت میں جو اصول اختیار کیا گیا ہے، اس کا ایک مفہوم وہ ہے جو آیت کے زمانہ نزول کے اعتبار سے ہے۔ اِسی کے ساتھ اِس آیت کا ایک وسیع تر مفہوم بھی ہے۔ اِس وسیع تر مفہوم کی روشنی میں آیت کا مطالعہ کیا جائے تو قرآن کی اِس آیت کے الفاظ موجودہ حالات کے اعتبار سے پوری طرح قابلِ انطباق (applicable) ہو جاتے ہیں۔ وہ یہ کہ آیت میں خیل، بغال، حمیر کے الفاظ علامتی طور پر قدیم زمانے کے ورلڈ آف نیچر (world of nature) کو بتاتے ہیں۔ اِسی طرح یخلق مالا تعلمون کے الفاظ بعد کے زمانے میں ظہور میں آنے والے ورلڈ آف ٹکنالوجی (world of technology) کو بتا رہے ہیں۔

3۔ موجودہ زمانہ میں جو مسائل پیدا ہوئے ہیں ان میں متفقہ طور پر، سب سے بڑا مسئلہ وہ ہے جس کو ماحولیاتی مسئلہ (ecological problem) کہا جاتا ہے۔ بے شمار دماغ اس مسئلہ پر کام کر رہے ہیں۔ مگر ابھی تک اس کا حل دریافت نہ ہو سکا۔ قرآن میں اس سلسلہ میں ایک آیت موجود ہے جو بتاتی ہے کہ اس معاملہ میں صحیح طرز فکر (right way of thinking) کیا ہے۔

قرآن کی سورہ الروم میں ایک آیت ان الفاظ میں آئی ہے: ظَهَرَ الْفَسَادُ فِي الْبَرِّ وَالْبَحْرِ بِمَا كَسَبَتْ أَيْدِي النَّاسِ لِيُذِيقَهُم بَعْضَ الَّذِي عَمِلُوا لَعَلَّهُمْ يَرْجِعُونَ (30:41)۔

اِس آیت میں غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اس میں دورِ صنعت کے اس ظاہرہ کا ذکر ہے

جس کو صنعتی کثافت (industrial pollution) کہا جاتا ہے۔ اسی کا نتیجہ ہے کہ فضا اور سمندر دونوں مہلک آلودگی (harmful pollution) کا کیس بن گئے ہیں۔

قرآن کی آیت کے مطابق یہ مسئلہ تمام تر انسانی ساخت کا مسئلہ (man-made problem) ہے۔ لعلھم یرجعون کا لفظ بتاتا ہے کہ اس مسئلہ کا حل صرف یہ ہے کہ انسان فطری طرز زندگی (natural lifestyle) کی طرف واپس جائے جس کو چھوڑنے کی وجہ سے یہ مسئلے پیدا ہوئے ہیں۔

اجتہاد ایک ضرورت

اجتہاد اصلاً کوئی زمانی ضرورت نہیں، بلکہ وہ ایک فطری ضرورت ہے۔ چنانچہ خود رسول اور اصحابِ رسول کے زمانہ میں بار بار اجتہاد کا عمل کیا گیا۔ اسی طرح آج بھی اجتہاد کیا جائے گا۔ اجتہاد کے عمل کے لئے نہ کسی نئی اصطلاح کی ضرورت ہے اور نہ کسی نئے منہج کو وضع کرنے کی ضرورت۔

موجودہ زمانہ میں اسلام کے موضوع پر بڑی تعداد میں کتابیں لکھی اور چھاپی گئی ہیں۔ ان میں سے جو کتاب کسی معلوماتی موضوع پر ہوتی ہے وہ تو قاری کے لئے قابلِ فہم ہوتی ہے۔ لیکن جو کتابیں اسلام کی توضیح وتعبیر کے موضوع پر لکھی گئی ہیں وہ تقریباً سب کی سب کنفیوزن کا شکار ہیں۔ قاری ان کتابوں کو پڑھتا ہے لیکن وہ اس طرح ان کو ختم کرتا ہے کہ ان کے ذریعہ قاری کو کوئی بصیرت حاصل نہیں ہوتی۔

اس کنفیوزن کا ایک بنیادی سبب یہ ہے کہ یہ تمام حضرات اپنے تجزیہ (analysis) میں ایک چیز اور دوسری چیز کے درمیان فرق کرنے کے اصول (principle of differentiation) نہیں جانتے ہیں۔ وہ اس فرق کو ملحوظ رکھے بغیر سوچتے ہیں اور اس فرق کو ملحوظ رکھے بغیر لکھتے ہیں۔ اس اصول کو قرآن میں فرقان (8:29) کہا گیا ہے۔ میرے تجربہ کے مطابق، موجودہ زمانے کے تقریباً تمام مقرر اور محرر فرقان کی حکمت سے بے خبر ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی تقریر اور تحریر میں ہمیشہ کنفیوزن رہتا ہے۔

مثلاً تفکیر کے موضوع پر کلام کرتے ہوئے مبنی بر قلب مراقبہ (heart-based meditation) اور مبنی بر ذہن تفکیر (mind-based contemplation) کے فرق کو نہ سمجھنا۔ فرد (individual)

کی اصلاح اور سماجی نظام (social system) کی تعمیر کے درمیان فرق کو ملحوظ نہ رکھنا۔ مسائل دنیا اور مسائل آخرت کے تقاضوں کے درمیان جو نوعی فرق ہے، اس کو سمجھے بغیر اس موضوع پر اظہار خیال کرنا۔ طبیعیاتی سائنس کے موضوع اور انسانیات (humanities) کے موضوع کے درمیان جو بنیادی فرق ہے اس سے گہری واقفیت کے بغیر ان موضوعات پر لکھنا اور بولنا، وغیرہ۔

حقیقت یہ ہے کہ جو لوگ فرقان (principle of differentiation) کو نہ جانتے ہوں ان کو صرف معلوماتی موضوع پر لکھنا اور بولنا چاہئے۔ ان کو ہرگز تفکیری موضوع پر کلام نہیں کرنا چاہئے۔ ایسا کرکے وہ اپنے قاری کو صرف کنفیوزن دیں گے وہ اپنے قاری کو واضح رہنمائی دینے سے قاصر رہیں گے۔ غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ مذکورہ مسلم دانشور کا مسئلہ بھی وہی ہے جو ان سے پہلے ڈاکٹر محمد اقبال کا مسئلہ تھا۔ دونوں ایک ہی مسئلہ کا شکار ہوئے۔ یعنی اپنے خود ساختہ ماڈل کی بنا پر مسئلہ کو غلط رخ (wrong angle) سے دیکھنا۔ ڈاکٹر محمد اقبال نے انسان ساز فلسفیانہ ماڈل کو لے کر اسلام کو سمجھنا چاہا جو اصلاً فطرت خداوندی پر مبنی تھا۔ اس عدم مطابقت کی بنا پر ڈاکٹر محمد اقبال اس مسئلہ کی صحیح تشریح وتعبیر کرنے میں ناکام رہے۔

مذکورہ مسلم دانشور کا کیس یہ ہے کہ وہ اصلاً علم اقتصادیات (economics) کے آدمی ہیں۔ اقتصادیات کا علم انسانی زندگی کے نظامی پہلو (infrastructural aspect) سے تعلق رکھتا ہے۔ یہ دوبارہ ایک انسان ساز علم ہے۔ اس بنا پر مذکورہ مسلم دانشور کا ذہن مبنی بر نظام ذہن بن گیا۔ وہ اسلام کی تعبیر اپنے نظامی ماڈل کی روشنی میں کرنے لگے۔ جب کہ اسلام کا ماڈل مختلف تھا۔ علم الاقتصاد کے تحت جو ماڈل بنتا ہے، وہ مبنی بر نظام ماڈل (system-based model) ہے، جب کہ اسلام ایک مبنی بر فرد مذہب ہے۔ اسلام کا ماڈل مبنی بر فرد ماڈل (individual-based model) ہے۔ اس عدم مطابقت کی بنا پر مذکورہ مسلم دانشور اس مسئلہ کی صحیح تعبیر وتشریح میں ناکام رہے۔

اس معاملہ کی ایک مثال یہ ہے کہ مذکورہ مسلم دانشور نے لکھا ہے کہ نیورو سائنس (neuroscience) کے نئے ابھرتے ہوئے ماہرین شاید اس معاملہ میں ہماری مدد کرسکیں۔ مگر یہ

بات زیر بحث مسئلہ سے بالکل غیر متعلق (irrelevant) ہے۔ نیوروسائنس کیا ہے۔ نیوروسائنس انسان کے اعصابی نظام کے سائنسی مطالعہ کا نام ہے:

"Neuroscience is the scientific study
of the nervous system"

زیر بحث مسئلہ کا تعلق مسائل حیات کی توجیہہ (explanation) سے ہے۔ اور یہ ایک معلوم بات ہے کہ سائنس کا کام توجیہہ کرنا نہیں ہے بلکہ صرف فطرت کے عمل کو دریافت کرنا ہے:

Neuroscience deals with the functioning of the mind.

زیر بحث مسئلہ سے انسانی ذہن کا تعلق واضح ہے لیکن یہاں جو مسئلہ ہے وہ مائنڈ کے فکری انطباق کا مسئلہ ہے نہ یہ کہ ذہن فزیکل معنوں میں کس طرح عمل کرتا ہے۔

It is a question of the application of the
mind, not the functioning of the mind.

مذکورہ مسلم دانشور کے مقالہ میں کنفیوزن کیوں ہے۔ اس کا سبب یہ ہے کہ تعلیم کے زمانے میں موصوف کا سبجیکٹ معاشیات (economics) تھا۔ انھوں نے اسی سبجکٹ میں اعلیٰ تعلیم حاصل کی اور اپنی پوری زندگی اسی سبجکٹ کا مطالعہ کرتے رہے۔ جیسا کہ معلوم ہے معاشیات ایک ایسا سبجکٹ ہے جس میں نظام (system) کے پہلو سے زندگی کا مطالعہ کیا جاتا ہے۔ اس طرح یہ ہوا کہ موصوف کے ذہن میں نظامی ماڈل (system-based model) بن گیا۔ وہ شعوری یا غیر شعوری طور پر نظامی ماڈل کو معیاری ماڈل سمجھنے لگے۔

اس کے بعد انھوں نے اپنے اسی ذاتی شاکلہ کی بنیاد پر اسلام کا مطالعہ کیا۔ انھوں نے چاہا کہ وہ اسلام کو ایک نظامی ماڈل (system-based model) میں ڈھال دیں۔ مگر اصل حقیقت یہ تھی کہ اسلام ایک مبنی بر فرد ماڈل تھا، نہ کہ مبنی بر نظام ماڈل۔ اس فرق کو نہ جاننے کی بنا پر ان کے افکار میں کنفیوزن پیدا ہو گیا۔

متبادل کو جانیے

ونسٹن چرچل (Winston Churchill) قدیم برٹش ایمپائر کے وزیر اعظم تھے، جس کا ایک حصہ انڈیا تھا۔ اس زمانے میں انڈیا میں فریڈم موومنٹ چل رہی تھی۔ چرچل نے انڈیا کو فریڈم دینے سے انکار کر دیا۔ انھوں نے کہا کہ میں برٹش گورنمنٹ کا فرسٹ منسٹر اس لیے نہیں بنا ہوں کہ میں برٹش ایمپائر کے خاتمے کی صدارت کروں:

I have not become the king's First Minister in order to preside over the liquidation of the British Empire.

ونسٹن چرچل برطانیہ کی کنزرویٹیو پارٹی (Conservative Party) کے لیڈر تھے۔ برطانیہ کی ایک اور پارٹی تھی، لیبر پارٹی (Labour Party)۔ اس کے لیڈر کلیمنٹ اٹلی (Clement Attlee) تھے۔ 1945 کے الیکشن میں لیبر پارٹی جیت گئی، اور اس کے لیڈر کلیمنٹ اٹلی برطانیہ کے پرائم منسٹر بنے۔ ان کی حکومت کے تحت 1947 کو برطانیہ نے انڈیا کو آزادی دے دی۔ 15 اگست 1947 کی رات کو بارہ بج کر ایک منٹ پر، برٹش وائسرائے ماؤنٹ بیٹن (Lord Mountbatten) نے آل انڈیا ریڈیو پر اعلان کیا کہ آج انڈیا آزاد ہے:

Today, India is free

ونسٹن چرچل اس معاملے میں صرف ایک بات جانتے تھے۔ انڈیا پر برٹش رول کو برقرار رکھنا۔ لیکن کلیمنٹ اٹلی نے دیکھا کہ اب حالات بدل چکے ہیں، اور انڈیا پر برٹش رول قائم نہیں رہ سکتا۔ چناں چہ انھوں نے اس معاملے میں ایک متبادل (alternative) تلاش کیا۔ وہ یہ کہ انڈیا کو پولٹیکل آزادی دینا اور اپنے اقتصادی مفادات (economic interest) کو باقی رکھنا۔ چناں چہ ایسا ہی ہوا۔ 1947 میں برطانیہ نے انڈیا کو سیاسی آزادی دے دی، اور اس کے بعد لمبے عرصے تک وہ انڈیا کی اقتصادیات کا سب سے بڑا پارٹنر بنا رہا۔

1947 سے پہلے انڈیا میں جو سیاسی حالات بنے تھے، وہ بتا رہے تھے کہ اب نوآبادیاتی نظام

کا دور ختم ہو چکا ہے۔ اب انڈیا میں برٹش حکومت جاری نہیں رہ سکتی۔ ان حالات میں برطانیہ کے مدبرین نے یہ دریافت کیا کہ یہاں ہمارے لیے ایک متبادل (alternative) موجود ہے۔ اور وہ ہے— انڈیا کو سیاسی آزادی دینا، اور اس کے بعد انڈیا میں اپنے اقتصادی مفادات کو محفوظ رکھنا۔ چناں چہ انھوں نے ایسا ہی کیا۔

واقعات بتاتے ہیں کہ 1947 کے بعد لمبی مدت تک برطانیہ کے اقتصادی مفادات بڑی حد تک محفوظ رہے۔ برطانیہ نے جو کچھ سیاسی میدان میں کھویا تھا، اس کو دوبارہ اس نے اقتصادی میدان میں حاصل کرلیا۔ یہی دنیا میں کامیابی کا راز ہے۔

جب بھی آپ دیکھیں کہ ایک فارمولا (formula) کام نہیں کر رہا ہے تو سوچئے، بہت جلد آپ دریافت کریں گے کہ یہاں ایک متبادل فارمولا (alternative formula) موجود ہے، جس کے ذریعے آپ اپنی کامیابی کا تسلسل قائم رکھ سکتے ہیں۔

چنئی اور حیدرآباد میں گڈ ورڈ بکس (Goodword Books) کے اسٹور قائم ہو گئے ہیں، اِن میں گڈ ورڈ بکس کی تمام مطبوعات، ماہ نامہ الرسالہ اور دعوتی لٹریچر دستیاب ہیں:

Goodword Books, Chennai
324, Triplicane High Road, Triplicane,
Chennai-600005
Tel. +9144-4352-4599, Mob. +91-9790853944, 9600105558
Email: chennaigoodword@gmail.com

Goodword Books, Hyderabad
2 Hyder Manzil, Ground Floor, H. No. 12-2-717/1/31/8,
Sapthagiri Colony, Ratibowli, Pillar No. 54, Hyderabad-500028. T. S.
E-mail: Hyd.goodword@gmail.com
Phones: 040-23514757, 7032641415, 09448651644

زندہ قومیں کس طرح کام کرتی ہیں

اسٹیٹس مین (یکم ستمبر 1967) کی ایک رپورٹ کو بہت کم اخباروں نے اہمیت دی۔ یہ ایک امریکی خاتون ڈاکٹر سارہ سی۔ گڈشنسکی (Sarah C. Gudschinsky) کی ہندستان میں آمد کی اطلاع تھی۔ دراصل بہت کم لوگ جانتے ہیں کہ یہ مشنری خاتون کس عظیم مگر خاموش ادارہ کی رکن ہیں اور کس خاص مقصد کے تحت ہندستان آئی ہیں۔

ڈاکٹر گڈشنسکی اوکلاہوما یونیورسٹی میں سمر انسٹی ٹیوٹ آف لنگسٹکس (اختصار SIL) کی فیکلٹی کی ممبر ہیں۔ اس مسیحی ادارہ نے تبلیغ کی دنیا میں ایک بالکل نیا میدان کھولا ہے— وہ اپنے کام کا آغاز ان قدیم قبائل میں کرتے ہیں جو نہایت پس ماندہ ہیں اور جن کی بولیاں ابھی تک پڑھنے لکھنے کی زبانیں نہیں بنی ہیں۔

یہ نہایت متمدن اور اعلی تعلیم یافتہ لوگ دنیا کی انتہائی غیر مہذب قوموں میں جا کر برسہا برس رہتے ہیں، ان کی بولیوں کو سیکھتے ہیں، پھر ان کے حروف تہجی بناتے ہیں، قواعد مرتب کرتے ہیں، نصابی کتابیں لکھتے ہیں، پریس قائم کرتے ہیں اور اس طرح ان کی زبانوں کو تحریری زبان بنا کر اور ان میں کتابیں تیار کر کے انھیں پڑھانا شروع کرتے ہیں۔ ان کی نصابی کتب میں بائبل کا ترجمہ بھی ضروری جزو ہوتا ہے۔

یہ ان کی خدمت کے لئے ان کی بستیوں میں جدید طرز کے اسپتال کھولتے ہیں۔ اس تعلیم اور اخلاقی اثر کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ جب یہ قبائل تعلیم یافتہ ہو جاتے ہیں تو وہ صرف تعلیم یافتہ نہیں ہوتے بلکہ اسی کے ساتھ عیسائی مذہب کو بھی قبول کر چکے ہوتے ہیں۔

اس ادارہ کا سب سے زیادہ نمایاں کام پیرو کے وسیع جنگلوں میں ہو رہا ہے جہاں کثرت سے قدیم وحشی قبائل بستے ہیں اور جن کے درمیان رابطہ کا ذریعہ صرف ہوائی جہاز اور کشتیاں ہیں۔ یہ مسیحی مبلّغین ان لق ودق جنگلوں کے اوپر ہوائی جہاز سے اڑتے ہیں اور ریڈیو اور ٹرانسمیٹر لے کر عین وحشی قبائل کی بستیوں

میں اتر جاتے ہیں جو نہ صرف مہذب انسانوں کے جانی دشمن ہیں بلکہ ان کی بولیاں اتنی مختلف ہیں کہ مہینوں تک ان کو سیکھنے کی صبر آزما جدوجہد کئے بغیر ان سے کوئی بات بھی نہیں کی جاسکتی۔

یہ جدوجہد تقریباً آدھی صدی سے جاری ہے اور اس کا نتیجہ یہ ہے کہ آج ان گھنے جنگلوں کے اندر اسکول، اسپتال، گرجا، ہوائی میدان، ریڈیو اسٹیشن اور نہیں معلوم کیا کیا قائم ہیں اور تیرہ مختلف زبانیں بولنے والے وحشی قبائل کی بہت بڑی تعداد مہذب اور تعلیم یافتہ ہوکر عیسائی ہوچکی ہے۔ یہ کام جو ابتداءً شمالی امریکہ کے جنگلوں میں شروع کیا گیا تھا، اب دنیا کے اٹھارہ ملکوں میں پھیلا ہوا ہے۔ ہندستان میں بھی مہاراشٹر اور مدھیہ پردیش میں دو ایسے ادارے قائم کئے جارہے ہیں اور یہی اس وقت ڈاکٹر گڈشنسکی کی یہاں آمد کا باعث ہے۔

غور کیجئے—— آج کی زندہ قومیں کتنی اونچی سطح سے کام کررہی ہیں۔ انھوں نے اپنے عمل اور جدوجہد کے ذریعہ دنیا سے زندگی کا حق وصول کیا ہے۔ اس کے برعکس ہمارا کیا حال ہے۔ ہم نے سمجھ رکھا ہے کہ سطحی تدبیروں اور جذباتی تقریروں سے سارا میدان فتح ہوجائے گا۔

(ہفت روزہ الجمعیۃ، 15 ستمبر 1967)

مالیگاؤں (مہاراشٹر) میں الرسالہ اور مطبوعات الرسالہ حسب ذیل پتہ پر دستیاب ہیں:

Mr. Usman
Goodword Books (Distributor)
71/1, Plot No. 11, Ansar Colony, Near Maharashtra Sizing,
Malegaon, Dist. Nashik, Maharashtra -423203, Mob. 08983759678

نوٹ: ہر جمعہ کو مذکورہ مقام پر بعد مغرب الرسالہ مشن کے ممبران کی میٹنگ بھی ہوتی ہے۔

بھوپال میں ماہنامہ الرسالہ اور مطبوعات الرسالہ کے لیے حسب ذیل پتے پر رابطہ قائم فرمائیں:

Mr. Bilaluddin
Al-Quran Mission
48, Aamwali Masjid, Jahangirabad, Bhopal (M.P.)
Mob. 09755300295, 07556542231

1- چھٹمل پور (سہارن پور) میں 5 مئی 2015 کو ایک شادی کے موقع پر صدر اسلامی مرکز کے دعوتی لٹریچر کو لوگوں کے درمیان تقسیم کیا گیا۔ اس موقع پر ضلع میرٹھ کے پولیس آفیسر بی آر پندیر (B. R. Pundeer) موجود تھے۔ انھوں نے یہ دعوتی لٹریچر خود بھی لیا اور دوسروں کو دیا- اس دعوتی لٹریچر کو سہارن پور کی سی پی ایس ٹیم نے اسپانسر کیا تھا- (ڈاکٹر محمد اسلم خان، سہارنپور)۔

2- تمل ناڈو کے نیل گری ضلع کے کُنّور میں ہنری مارٹن انسٹی ٹیوٹ (حیدر آباد) کی طرف سے 10-13 مئی 2015 کے درمیان سینٹ تھیوڈورس ریٹریٹ سینٹر (Theodore's Retreat Centre) میں ایک انٹر فیتھ کانفرنس کا انعقاد کیا گیا تھا- سی پی ایس (بنگلور) کی ٹیم نے اس میں شرکت کی۔ کانفرنس میں جن عنوانات کے تحت لکچر دیے گیے ان میں سے چند یہ ہیں: ریلیجن اینڈ اسپریچولٹی، اسلام اینڈ پیس اور وومن اِن اسلام۔ اس موقع پر تمام شرکاء کے درمیان سی پی ایس کا دعوتی لٹریچر بھی تقسیم کیا گیا- لوگوں نے خوشی کے ساتھ ان کو حاصل کیا- نیز شرکاء کانفرنس کے علاوہ مقامی مسلمانوں سے انفرادی طور پر دعوتی انٹرایکشن بھی ہوا-

3- یونیسیف (UNICEF) کی چائلڈ پروٹیکشن اسپیشلسٹ مز ڈورا (Dora Giusti) نے صدر اسلامی مرکز کا انٹرویو لیا۔ یہ انٹرویو بچوں کے خلاف ہونے والے تشدد کی روک تھام کے سلسلے میں تھا۔ صدر اسلامی مرکز نے اس سلسلے میں انھیں مفید مشوروں سے نوازا۔ یہ ملاقات 6 جون 2015 کو ہوئی۔ آخر میں انھیں انگلش ترجمہ قرآن اور صدر اسلامی مرکز کی کتابوں کا ایک سیٹ بطور تحفہ دیا گیا، جسے انھوں نے شکریہ کے ساتھ قبول کیا۔

4- الہ آباد میں ترجمہ قرآن ڈسٹری بیوشن کا کام اکتوبر 2013 سے ہو رہا ہے۔ بطور خاص تعلیم یافتہ افراد کے اجتماعات میں قرآن ڈسٹری بیوشن کا کام بڑے پیمانے پر ہو رہا ہے۔ مثلاً غوث گرل میموریل کالج اور حمیدیہ گرلس ڈگری کالج میں الوداعیہ تقریب کے موقع پر طلباء نے اپنے اساتذہ اور اپنے سینئرس کو ترجمہ قرآن کے نسخے ہدیہ کیے- اسی طرح خواتین کے اجتماع کے موقع پر قرآن کے نسخے تقسیم کیے گئے۔ اہل حدیث کے ایک پروگرام میں غیر مسلموں کے درمیان ترجمہ قرآن تقسیم کیا گیا، تمام حضرات نے شکریہ کے ساتھ اس کو قبول کیا اور اپنی خوشی کا اظہار کیا- (محمد ابرار نرالا، الہ آباد)

5- الحمد للہ الرسالہ مشن کا دعوتی کام برما میں کافی عرصہ سے ہو رہا ہے۔ جناب عبد العزیز صاحب اور مولانا شوکت صاحب ایک ٹیم کے ساتھ مل کر یہ دعوتی کام انجام دے رہے ہیں۔ پچھلے دنوں صدر اسلامی مرکز کی کتاب 'احیاء اسلام' کا برمی زبان میں ترجمہ شائع ہو چکا ہے۔ یہ ترجمہ مسٹر جاوید انصاری نے کیا ہے۔ اس کے علاوہ پچھلے تین سال سے مستقل طور پر الرسالہ کی کاپیاں وہاں جا رہی ہیں-

6- یروشلم (اسرائیل) اور اس کے آس پاس کے علاقہ میں پوری دنیا سے آنے والے سیاحوں کے

درمیان دعوتی کام کافی منظم انداز میں ہو رہا ہے- چند فلسطینی نوجوانوں نے 'دار السلام برائے تعارف اسلام' (DAR AS-SALAM FOR INTRODUCING ISLAM) کے نام سے 2013 میں ایک آرگنائزیشن قائم کیا، اور اس کے تحت یہ لوگ اسرائیل میں دعوت کا کام پرامن انداز میں کر رہے ہیں۔ یہ لوگ سیاحوں کے درمیان صدر اسلامی مرکز کا انگلش ترجمۂ قرآن اور ان کی کتاب 'وہاٹ از اسلام' تقسیم کرتے ہیں-

7- ذیل میں چند دعوتی تجربات وتاثرات دیئے جارہے ہیں:

آپ کی کتابوں کے مطالعے سے مجھے کافی فائدہ ہوا ہے- ایک وقت جب کہ میں پریشانیوں میں مبتلا تھا، آپ کی کتاب 'رازِ حیات' کے مطالعہ سے مجھے کافی ہمت اور حوصلہ ملا، اور ایک نئی طاقت وقوت کے ساتھ زندگی کی جدوجہد کے لئے میں نے خود کو دوبارہ تیار کیا- (عرفان احمد، کینیا)

میری لینڈ، امریکا سے مزگل زیبا احمد لکھتی ہیں:

Maulana Saheb, I was introduced to your mission in 2004 while I was still in Pakistan. Although I had read other writers before, it was you who introduced me to what Islam demands from us. Since then I have involved myself in dawah work. I use your literature for dawah work and am very thankful to God for this. I always keep copies of the Quran translation and supporting material with me. I share these with people whenever I get a chance. In the USA, we have started holding spiritual classes for women every Saturday. Apart from this, since January 2015, I have been giving a class to my two young nieces and their friend every Sunday at our local public library. They all are around 12 years old. They enjoy reading Spirit of Islam the most. Some of their feedback is given below:

> After reading this book, my life has changed drastically. I love how this book explains the meaning of the Quran in scientific and current ways. This book is short and easy to read, but it has a lot of lessons. I have learnt the importance of prayer, peace, and patience. After reading, I've realized why Islam is peaceful. (Maira Usman, USA)
>
> Spirit of Islam benefited me by helping me learn about honesty, the importance of not denying the truth, respecting others, and treating everyone equally. (Sara Amin and Vaniya Khan, USA)

- اگر آپ کے پاس وقت کم ہے ...
- اور آپ مختصر وقت میں کسی تعمیری پرچہ کا مطالعہ کرنا چاہتے ہیں ...
- اگر آپ چاہتے ہیں کہ حکمت ونصیحت سے بھرپور سبق آموز واقعات مسلسل آپ کے مطالعہ میں رہیں ...
- اگر آپ عصری اسلوب میں اسلام کو پڑھنا چاہتے ہیں ...
- اگر آپ الحاد ولادینیت کی رد میں سائنٹفک مضامین کا مطالعہ کرنا چاہتے ہیں ...
- اگر آپ ایک ایسے رسالہ کے متلاشی ہیں جس میں قیامت کی یاددہانی، حشر ونشر کی ہولناکیاں، جنت وجہنم کے مناظر، خدائے ذوالجلال کی تجلّیاں، سیرتِ رسول کی جھلکیاں، صحابۂ کرام کی بے مثال قربانیاں ہوں ...

تو آپ

ہر مقام پر دینی رسالوں میں سب سے زیادہ پڑھا جانے والا

مولانا وحید الدین خاں صاحب کا دینی وفکری وعلمی ماہ نامہ

الرسالہ (اردو، انگریزی)

کا مطالعہ کیجئے

الرسالہ (اردو) کے لئے رابطہ فرمائیں:

Al-Risala Monthly
1, Nizamuddin West Market
New Delhi-110 013
Tel. 08588822674, 011-465241511

الرسالہ (انگریزی) کے لئے رابطہ فرمائیں:

Spirit of Islam
Centre for Peace, Bangalore
Tel. 080-22118978, Mob. 09060511653
Email.: thecentreforpeace@gmail.com

عصری اسلوب میں اسلامی لٹریچر، مولانا وحید الدین خاں کے قلم سے

اللہ اکبر	تاریخ دعوت حق	ڈائری 90-1989	فسادات کا مسئلہ
اتحادِ ملّت	تاریخ کا سبق	ڈائری 92-1991	فکر اسلامی
احیاء اسلام	تبلیغی تحریک	ڈائری 94-1993	قال اللہ وقال الرسول
اسباق تاریخ	تجدید دین	رازِ حیات	قرآن کا مطلوب انسان
اسفار ہند	تصویر ملت	راہ عمل	قیادت نامہ
اسلام: ایک تعارف	تعارف اسلام	راہیں بند نہیں	کاروانِ ملت
اسلام: ایک عظیم جدوجہد	تعبیر کی غلطی	روشن مستقبل	کتابِ زندگی
اسلام اور عصر حاضر	تعدد ازواج	رہنمائے حیات (پمفلٹ)	کتابِ معرفت
اسلام پندرہویں صدی میں	تعمیر انسانیت	رہنمائے حیات	کشمیر میں امن
اسلام دور جدید کا خالق	تعمیر حیات	زلزلہ قیامت	مارکسزم: تاریخ جس کو رد کر چکی ہے
اسلام دین فطرت	تعمیر کی طرف	سبق آموز واقعات	مذہب اور جدید چیلنج
اسلام کا تعارف	تعمیر ملت	سچا راستہ	مذہب اور سائنس
اسلام کیا ہے	حدیث رسول	سفر نامہ اسپین و فلسطین	مسائل اجتہاد
اسلامی تعلیمات	حقیقت حج	سفر نامہ (غیر ملکی اسفار، جلد اول)	مضامین اسلام
اسلامی جہاد (جدید)	حقیقت کی تلاش	سفر نامہ (غیر ملکی اسفار، جلد دوم)	مطالعۂ حدیث
اسلامی دعوت	حکمتِ اسلام	سوشلزم اور اسلام	مطالعۂ سیرت (پمفلٹ)
اسلامی زندگی	حل یہاں ہے	سوشلزم ایک غیر اسلامی نظریہ	مطالعۂ سیرت
اظہارِ دین	حیات طیبہ	سیرتِ رسول	مطالعۂ قرآن
اقوالِ حکمت	خاتونِ اسلام	شتم رسول کا مسئلہ	منزل کی طرف
الاسلام	خاندانی زندگی (پمفلٹ)	شہادت: امت مسلمہ کا مشن (جدید)	مولانا مودودی، شخصیت اور تحریک (ڈاکٹر فریدہ خانم)
الربانیہ	خدا اور انسان	صراطِ مستقیم	میوات کا سفر
امن عالم	خلیج ڈائری	صوم رمضان	نار جہنم
امہات المومنین (ڈاکٹر فریدہ خانم)	دعوت اسلام	طلاق اسلام میں	نشری تقریریں
انسان اپنے آپ کو پہچان	دعوت حق	ظہور اسلام	نئے عہد کے دروازے پر
انسان کی منزل	دین انسانیت	عظمت اسلام	ہندستان آزادی کے بعد
ایمانی طاقت	دین کامل	عظمت صحابہ	ہندستانی مسلمان
آخری سفر	دین کی سیاسی تعبیر	عظمت قرآن	ہند- پاک ڈائری
باغ جنت	دین کیا ہے	عظمتِ مومن	یکساں سول کوڈ
پیغمبر اسلام	دین و شریعت	عقلیاتِ اسلام	
پیغمبر انقلاب	دینی تعلیم	علماء اور دور جدید	
تذکیر القرآن	ڈائری 84-1983	عورت معمارِ انسانیت	

Date of Posting 10th and 11th of advance month
Published on the 1st of every month
Postal Regn. No. DL(S)-01/3130/2015-17
RNI 28822/76
Licenced to Post without Prepayment U (SE) 12/2015-17

Islam and World Peace

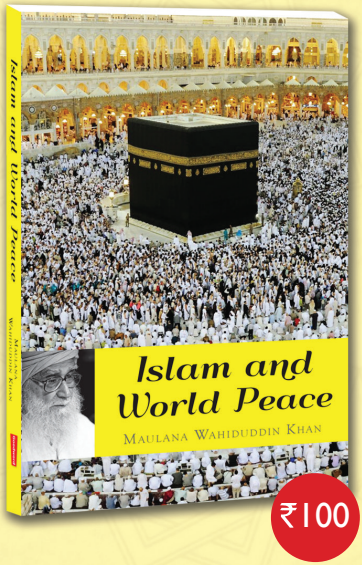

Lucidly written and expansive in scope, this work clears up the misunderstandings that abound on the subject of Islamic teachings about peace and war. It clearly states the authentic position on these matters, which is that Islam is a completely peaceful religion. In Islam, peace is the general rule or norm, and war is only an exception. Of the various names or attributes of God mentioned in the Quran, one is *As-Salam*, or 'The Source of Peace'. That is to say, God is Peace. Islam's mission centres on tawhid, the oneness of God. The Quran and the Prophet's life clearly aim to transform people's minds and hearts that they love just the one God, fear Him alone and make Him their greatest concern. This is the beginning of the Islamic mission as well as its finale. Ideal for students, scholars and the average reader, this brief and readable book provides keen insight into topics such as, the culture of peace, the 'Islamisation' of violence, terrorism, Islamic jihad, hijacking and hostage-taking, to name but a few.

Pages: 200